اکیسوی صدی کے
سماجی مسائل اور اسلام

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

اکیسوی صدی کے سماجی مسائل
اور اسلام

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

مکتبہ قاسم العلوم

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ———— [illegible]
[illegible]

مصنف ———— [illegible]

اہتمام ———— [illegible]

مطبع ———— [illegible] پریس

ناشر ———— [illegible]

ڈسٹری بیوٹر

ملک اینڈ کمپنی

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ پاکستان
Ph: 042-37244209 Mob: 0321-4021416

ترتیب

پیش لفظ ۱۱

مقدمہ ۱۳

نکاح کے بغیر جنسی تعلق ۲۱

- عالمی صورت حال ۲۲
- ہندوستان کا حال ۲۳
- اسباب اور قائلین جواز کے دلائل ۲۵
- نظام خاندان۔ فطرت کا تقاضا ۲۶
- تمدن کی ترقی خاندانی نظام پر منحصر ہے ۲۷
- خاندان انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے ۲۸
- عورت کا سراسر خسارہ ۲۸
- بے قید معاشرت کے تلخ نتائج ۳۰
- موہوم فائدے ۳۰
- اسلام کا نقطۂ نظر ۳۱
- خاندان اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے ۳۱
- نکاح جنسی تعلق کا واحد جائز ذریعہ ۳۲
- زنا کی حرمت ۳۳
- بغیر نکاح کے باہم رضامندی سے بھی جنسی تعلق کی اجازت نہیں ۳۵
- خاندان کے استحکام کی دیگر تدابیر ۳۶

جنسی بے راہ روی اور زنا کاری ۳۷

- موجودہ صورت حال ۳۷
- سخت تر سزا کا مطالبہ ۳۸

جرائم کی روک تھام محض قانون سے ممکن نہیں ۳۹
پورے اسلامی نظام کا نفاذ ضروری ہے ۳۹
جنس کے تعلق سے مختلف رویے ۴۰
اسلام کا نقطہ نظر ۴۱
صرف نکاح کے ذریعے جنسی خواہش پوری کی جائے ۴۲
نکاح کی ترغیب اور اسے آسان بنانا ۴۳
تعدد ازدواج کی اجازت ۴۵
دوسرا نکاح معیوب نہیں ۴۶
اسلامی عقائد۔ تربیت کا اہم ذریعہ ۴۷
(الف) اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے ۴۸
(ب) آخرت میں دنیا کے ہر عمل کا حساب ہوگا ۴۹
جذبہ حیا کا فروغ ۵۰
معاشرہ کی پاکیزگی کے لیے احتیاطی تدابیر ۵۱
۱۔ نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم ۵۱
۲۔ نامحرم کے ساتھ تنہائی میں رہنے کی ممانعت ۵۲
۳۔ آزادانہ اختلاط پسندیدہ نہیں ۵۳
۴۔ بغیر محرم عورت کے سفر پر پابندی ۵۳
۵۔ عورت کے بن سنور کر اور خوشبو لگا کر نکلنے کی ممانعت ۵۴
۶۔ لباس ساتر ہو ۵۵
۷۔ پردہ کا خصوصی حکم ۵۶
بدکاری کے محرکات پر پابندی ۵۶
(الف) شراب حرام ہے ۵۶
(ب) فحاشی کی اشاعت کی اجازت نہیں ۵۷
زنا کی سزا ۵۸
سزا کے نفاذ کے لیے قطعی ثبوت ضروری ہے ۵۹
تطہیر معاشرہ کا آزمودہ نسخہ ۶۰

رحم مادر کا اجرت پر حصول ۶۱
تاریخ اور موجودہ صورت حال ۶۲
ہندوستان میں اجرت پر رحم مادر کا حصول ۶۳
دوسری عورت کا رحم اجرت پر لینے کے اسباب ۶۴
قائم مقام مادریت کی صورتیں ۶۴
اخلاقی اور تہذیبی جواز؟ ۶۵
اسلام کی بنیادی تعلیمات ۶۶
(الف) نکاح۔ توالد و تناسل کا واحد جائز ذریعہ ۶۶
(ب) مرد کے نطفے سے کسی غیر عورت کو بارآور نہیں کیا جا سکتا ۶۷
(ج) شرم گاہ کی حفاظت ۶۸
(د) نسب کی حفاظت ضروری ہے ۶۹
رحم کی کرایہ داری۔ اسلام کا نقطۂ نظر ۷۰
قائم مقام مادریت کی ایک جائز صورت ۷۲
ایک شاذ رائے ۷۳
ہم جنسیت کا فتنہ ۷۵
ہم جنسیت۔ فکر اور فلسفہ ۷۵
مغرب کی ہم جوئی ۷۷
ہندوستان کا حال ۷۸
کیا ہم جنسیت پر پابندی بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے؟ ۷۹
باہم رضامندی کا غلط تصور ۸۰
کیا یہ ذہنیت موروثی ہے؟ ۸۱
نفسیاتی مرض ۸۱
نظامِ فطرت سے بغاوت ۸۲
خاندان اور تمدن کی پامالی ۸۳
صحتِ عامہ کو خطرہ ۸۴
سرمایہ دارانہ استعمار کی سازش ۸۶

تمام مذاہب ہم جنسیت کے خلاف ہیں ۸۷
اسلام کا نظریہ جنس ۸۸
قوم لوط سے عبرت پذیری ۹۰
رسول اللہ ﷺ کی تنبیہات ۹۲
فقہاء کا نقطہ نظر ۹۵
متمدن سماج کی ذمہ داری ۹۵
مصنوعی طریقہ ہائے تولید ۹۷
تولیدی حیاتیات ۹۸
فطری طریقہ تولید ۹۸
فطری طریقہ تولید میں نقائص ۹۹
مصنوعی طریقہ ہائے تولید سے استفادہ؟ ۱۰۰
مصنوعی بارآوری ۱۰۱
ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری ۱۰۲
(الف) شوہر کے نطفے سے بارآوری ۱۰۳
(ب) غیر مرد کے نطفے سے بارآوری ۱۰۵
اسپرم بینک میں شوہر کا نطفہ ۱۰۷
انتقال بیضہ ۱۰۷
قائم مقام مادریت ۱۰۷
حاصل بحث ۱۱۰
اسپرم بینک: تصور اور مسائل ۱۱۱
فطری طریقہ تولید اور اس میں نقائص ۱۱۱
مصنوعی تلقیح کے میدان میں میڈیکل سائنس کی ترقیات ۱۱۲
مصنوعی تلقیح اور اسپرم بینک ۱۱۳
اسپرم بینک کا آغاز وارتقاء ۱۱۶
موجودہ دور میں اسپرم بینکوں کا دائرہ اور طریقہ کار ۱۱۷

اسپرم بینک۔ مغربی کلچر کی دین ۱۲۱

نظام خاندان پر کاری ضرب ۱۲۲

نسب کی پامالی ۱۲۲

انسانی تجارت کا پیش خیمہ ۱۲۳

اسلام کا نقطۂ نظر ۱۲۴

کسی اجنبی مرد کے نطفے سے بارآوری زنا کے مترادف ہے ۱۲۴

عمدہ نطفے کا انتخاب۔ جاہلی طریقہ ۱۲۶

شوہر کے انتقال کے بعد اس کے محفوظ نطفے سے بارآوری جائز نہیں ۱۲۷

شوہر کی زندگی میں اس کے محفوظ نطفے سے بارآوری کا حکم ۱۲۸

اسپرم بینک کا قیام اور اسپرم کی خرید فروخت ۱۲۹

رحم مادر میں بچیوں کا قتل ۱۳۱

نسل انسانی کے وجود و تسلسل کا فطری نظام ۱۳۲

نظام فطرت میں انسانی دخل اندازی سے عدم توازن پیدا ہوا ہے ۱۳۴

سماج میں لڑکیوں کی کم تر حیثیت ۱۳۵

نزول قرآن کے زمانے کی صورت حال ۱۳۶

لڑکیوں کو زندہ در گور کرنا۔ ایک جاہلی رسم ۱۳۸

جدید جاہلیت ۱۳۹

موجودہ قوانین کی بے بسی ۱۴۰

اسلام کی انسدادی تدابیر ۱۴۱

ذہنی تربیت ۱۴۱

اندیشۂ فقر کا ازالہ ۱۴۲

لڑکیوں کو زندہ در گور کرنے کی حرمت ۱۴۳

آخرت میں سخت سزا کی وعید ۱۴۳

رسول اللہ ﷺ اولاد کو قتل نہ کرنے کا عہد لیا کرتے تھے ۱۴۴

لڑکیوں کی پرورش اور کفالت پر جنت کی بشارت ۱۴۶
لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی فضیلت ۱۴۸
گھریلو تشدد ۱۵۱
مظلومیت نسواں عہد قدیم میں ۱۵۱
تحریک آزادیٔ نسواں کے ثمرات ۱۵۲
عورت پھر بھی مظلوم رہی ۱۵۳
گھریلو تشدد: عالمی صورت حال ۱۵۴
صورت حال کے جائزے اور تدارک کے لیے عالمی کوششیں ۱۵۶
دس ممالک میں اقوام متحدہ کا سروے ۱۵۸
دیگر ممالک کا جائزہ ۱۵۹
گھریلو تشدد کی روک تھام کے لیے عصری قوانین ۱۶۲
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ۱۶۴
غلط تشخیص، غلط علاج ۱۶۵
گھریلو تشدد روکنے کے لیے اسلام کی تدابیر ۱۶۶
(۱) مرد اور عورت رفیق ہیں نہ کہ فریق ۱۶۶
(۲) حقوق میں مساوات اور فطری تقسیم کار ۱۶۶
(۳) مرد کی ذمہ داری خاندان کی حفاظت اور نگرانی ۱۶۷
(۴) عورت کو شوہر کی اطاعت کی تاکید ۱۶۸
(۵) مرد کو بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت ۱۷۰
(۶) عورت پر تشدد نہ کرنے کے صریح احکام ۱۷۱
(۷) بے جا تشدد پر شوہر کی تعزیر ہوگی ۱۷۳
نافرمانی اور سرکشی کی صورت میں تادیب کی اجازت ہے ۱۷۴
نشوز کیا ہے؟ ۱۷۵
مقصود تادیب ہے نہ کہ تشدد ۱۷۷

اصلاحی تدابیر اختیار کرنے میں تدریج ۱۷۹

مارنے کا حکم موجب قدح نہیں ۱۸۰

بوڑھوں کے عافیت کدے ۱۸۳

نوعیت مسئلہ ۱۸۳

'اولڈ ایج ہومس' کی تاریخ اور موجودہ صورت حال ۱۸۴

فراہم کی جانے والی سہولیات ۱۸۶

بوڑھوں کی اپنے گھروں سے بیزاری کے اسباب ۱۸۷

کوئی ادارہ خاندان کا متبادل نہیں ۱۸۸

اسلام کا نقطۂ نظر ۱۹۰

بڑھاپا انسانی زندگی کا ایک فطری مرحلہ ہے ۱۹۰

افرادِ خاندان کے درمیان قربت اور گہرا تعلق ۱۹۲

رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم ۱۹۳

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید ۱۹۴

بوڑھے والدین کے ساتھ حسنِ معاملہ کا خصوصی حکم ۱۹۸

قرآن کریم کا دل کش بیان ۲۰۰

ماں باپ کو اُف نہ کہنے کا مطلب ۲۰۲

بدزبانی کی ممانعت ۲۰۳

نرمی اور ادب سے بات کرنے کا حکم ۲۰۳

غایت درجہ تعظیم اور احترام کی تاکید ۲۰۴

مکمل خدمت گزاری کی تلقین ۲۰۵

والدین کو خوش رکھنے کی کوشش کی جائے ۲۰۶

والدین کی معاشی ضروریات کی تکمیل ۲۰۹

والدین کے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے ۲۱۱

اسلامی تعلیمات کے اثرات ۲۱۱

اسلام اولڈ ایج ہومس کے قیام کا مخالف نہیں ہے ۲۱۲

پلاسٹک سرجری ۲۱۳
تاریخی پس منظر ۲۱۳
نیا زمانہ، نئے مسائل ۲۱۶
مقاصد اور میدان عمل ۲۱۸
سرجری کا طریقہ کار ۲۱۹
حل طلب مسائل ۲۲۰
اسلام کی اصولی تعلیمات ۲۲۱
پلاسٹک سرجری کی مختلف صورتوں کے بارے میں شرعی حکم ۲۲۳
۱۔ خلقی بدہیئتی، جو عام قانون فطرت کے خلاف ہو ۲۲۴
۲۔ کسی حادثہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بدہیئتی ۲۲۵
۳۔ بعض جسمانی ہیئتوں کی تبدیلی ۲۲۷
۴۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ظاہر ہونے والی ہیئتیں ۲۲۸
۵۔ کم عمر یا خوب صورت نظر آنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا ۲۲۹
۶۔ شناخت چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا ۲۳۵
خلاصۂ بحث ۲۳۶
عام تباہی کے اسلحہ کا استعمال ۲۳۷
مسئلہ کا سیاسی پہلو ۲۳۸
اسلام کی چند اصولی تعلیمات ۲۳۹
نئی صورت حال ۲۴۳
اسلام کا نقطۂ نظر ۲۴۳
جواز کے قائلین ۲۴۳
عدم جواز کے قائلین ۲۴۷
تجزیہ و محاکمہ ۲۵۱
موتمر العالم الاسلامی کی قرارداد ۲۵۲
کتابیات ۲۵۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اکیسویں صدی اپنے جلو میں جہاں حیرت انگیز سائنسی ایجادات، تمدنی ترقیات اور سفر و حضر کی سہولیات لے کر آئی ہے، وہیں بہت سے ایسے سماجی اور اخلاقی مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، جن سے دنیا فتنہ و فساد کی آماج گاہ بن گئی ہے، اخلاقیات کا جنازہ نکل گیا ہے اور انسانی سماج حیوانات کے باڑے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ عالمی سطح پر سماجی مفکرین اور مصلحین ان مسائل سے پریشان ہیں، لیکن انھیں کوئی راہ عمل نہیں سجھائی دے رہی ہے۔

اسلامی تعلیمات پر عمل کے نتیجے میں جو معاشرہ وجود میں آتا ہے اس میں یہ مسائل پیدا ہی نہیں ہوتے اور جو انسانی معاشرے ان مسائل سے دو چار ہیں، اگر ان میں حقیقی اسلامی تعلیمات کو نافذ کیا جائے تو ان مسائل کو بہ خوبی حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں اسلام کو اتنا بدنام کر دیا گیا ہے اور اس کی تصویر اتنی مسخ کر دی گئی ہے کہ وہ عالم انسانیت کے لیے رحمت کے بجائے زحمت معلوم ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسلام کے بارے میں پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں دور کی جائیں اور اس کی صحیح تصویر پیش کی جائے۔

راقم سطور نے ۲۰۱۱ کے اوائل سے 'عالمی سماجی مسائل اور اسلام' کے موضوع پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ اس کی ابتدا ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ سے ہوئی تھی۔ پھر ستمبر ۲۰۱۱ء میں مرکز جماعت اسلامی ہند کی تصنیفی اکیڈمی سے وابستہ ہونے کے بعد بھی اس نے اس موضوع پر کام جاری رکھا اور ایک ایک مسئلہ پر مستقل مقالہ تیار کیا۔ انھی مقالات کا مجموعہ زیر نظر کتاب کی صورت میں ہدیۂ قارئین ہے۔ 'پلاسٹک سرجری اور اسلام' کے عنوان سے مقالہ اسلامک فقہ

اکیڈمی (انڈیا) کے سالانہ سیمینار منعقدہ، ورائی (تامل ناڈو) ۲۸/ فروری تا ۲/ مارچ ۲۰۰۹ء، اور 'عام تباہی کے اسلحہ کا استعمال' کے عنوان سے مقالہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے سیمینار بہ عنوان Peace and Progress: Role of Religions منعقدہ ۱۱-۱۲/ فروری ۲۰۱۲ء علی گڑھ میں پیش کیا گیا تھا۔ موضوع کی مناسبت سے انھیں بھی شامل کتاب کر دیا گیا ہے۔ ان مقالات میں بعض مباحث کی تکرار پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں تکرار حذف کر دی گئی ہے، لیکن کہیں کہیں اسے حسب ضرورت باقی رکھا گیا ہے۔

ان مقالات میں سے بیش تر سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ میں شائع ہوئے ہیں۔ راقم سطور کے لیے خوشی، اطمینان اور شرف کی بات یہ ہے کہ اس کے محسن و مربی مولانا سید جلال الدین عمری، امیر جماعت اسلامی ہند و صدر ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ نے اشاعت سے قبل ان پر نظر ڈالی ہے، ان کی نوک پلک درست کی ہے اور ان کے مواد کو بہتر بنانے کے لیے قیمتی مشورے دیے ہیں اور اشاعت کے بعد قارئین نے انھیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے اور تحسین و آفریں کے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے متعدد مقالات افادۂ عام کے لیے کتابچوں کی صورت میں شائع ہوئے، ان کے متعدد ایڈیشن نکلے اور مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے کیے گئے۔ امید ہے، اس کتاب میں ان کی شمولیت سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہوگا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس عاجز سے مزید دین کی خدمت کا کام لے اور اسے اخلاص سے نوازے۔ انہ قریب سمیع مجیب۔

۲۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
۱۸/ ستمبر ۲۰۱۲ء

محمد رضی الاسلام ندوی
سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند

مقدمہ

گزشتہ چند صدیوں میں مختلف مغربی ممالک میں بنیادی انسانی حقوق کے پرزور نعرے لگائے گئے اور ان کے لیے زبردست تحریکیں چلائی گئیں۔ اس کے نتیجے میں مطلق العنان حکم رانوں کے لامحدود اختیارات پر قدغن لگی اور بے بس اور مجبور انسانوں کو بہت سے وہ حقوق اور اختیارات حاصل ہوئے جن سے وہ صدیوں سے محروم تھے۔ دھیرے دھیرے عوام طاقت ور ہوتے گئے تو ان کو حاصل ہونے والے حقوق میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں آزادی، مساوات اور عدل وانصاف کے تصورات کو فروغ ملا۔ ان کے ثمرات وفوائد سے یوں تو عام انسان بہرہ ور ہوئے، لیکن خاص طور پر عورتوں کو ان کا حظ وافر ملا۔ وہ صدیوں سے اپنے تمام حقوق سے محروم تھیں۔ انھیں مردوں کا محکوم اور زیر نگیں سمجھا جاتا تھا۔ ان تحریکوں نے انھیں محرومی اور جبر سے آزادی اور زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے برابر درجہ دینے اور انھی جیسا معاملہ کرنے کی وکالت کی۔

بنیادی حقوق (Fundamental Rights) مساوی حقوق (Equal Rights) اور آزادیٔ نسواں (Emancipation of women) کے نام سے برپا ہونے والی یہ تحریکیں اصلاً مغربی ماحول کی پیداوار تھیں اور کلیسا کے جبر اور عورتوں کے بارے میں مسیحی نقطۂ نظر نے اس کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ اس لیے یہ ردِ عمل کی نفسیات کا شکار تھیں۔ تفریط کے ردِ عمل میں افراط نے جنم لیا اور حدود وقیود سے ماوراء ہر طرح کی آزادی اور مرد وزن کے درمیان ہر اعتبار سے مساوات کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ان تحریکوں کے اثرات کو مشرقی ممالک نے بھی قبول

کیا اور اگرچہ ان کا تہذیبی و ثقافتی اور تاریخی پس منظر مغربی ممالک سے مختلف اور جداگانہ تھا، لیکن وہاں بھی ان تحریکوں کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور آزادی و مساوات کے ان تصورات کو کافی فروغ ملا۔

اخلاق و اقدار سے عاری ان تصورات نے یوں تو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا ہے، لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر نظام خاندان پر پڑا ہے۔ اس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ بری طرح شکست و ریخت سے دوچار ہوا ہے، اباحیت اور آزاد شہوت رانی کی مختلف صورتوں کو فروغ ملا ہے، سماجی ذمہ داریوں سے فرار کا رجحان بڑھا ہے اور اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہوئی ہیں۔

خاندان کی تشکیل مرد اور عورت کے باضابطہ جنسی تعلق سے ہوتی ہے۔ یہ تعلق ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریاں متعین کرتا ہے، جن کی پاس داری بہتر خطوط پر افراد خاندان کے رہن سہن اور نشوونما کے لیے ضروری ہوتی ہے، لیکن ذمہ داریوں سے بچتے ہوئے لذت کے حصول کے رجحان نے ضابطے کے ساتھ جنسی تعلق کو فرسودہ قرار دیا اور بغیر نکاح کے آزاد جنسی رابطہ (Pre Marital Sexual Permissiveness) کو سندِ جواز عطا کی۔ یہ دلیل دی گئی کہ اگر نکاح کے بندھن میں بندھ کر کوئی مرد اور عورت ایک ساتھ زندگی گزاریں گے تو کچھ عرصے کے بعد ناپسندیدگی یا کسی اور وجہ سے الگ ہونے میں قانونی رکاوٹیں ہوں گی، اس لیے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ بغیر نکاح کے وہ ایک ساتھ رہیں اور جب ان کا جی بھر جائے، ایک دوسرے سے علٰیحدہ ہو جائیں۔ جدید اصطلاح میں اسے Live in Relationship کا نام دیا گیا ہے۔ یہ وبا مغربی ملکوں میں تو پہلے سے عام تھی، ہندوستان میں، جو مذہبی پس منظر رکھتا ہے، اسے عموماً ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن اب دھیرے دھیرے اس کے حق میں فضا ہموار کی جا رہی ہے۔

یہ تو قبل از نکاح جنسی تعلق کا معاملہ تھا۔ بعد از نکاح جنسی آزادروی کے معاملے میں تو اس سے بھی زیادہ کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے۔ کہا گیا کہ ہر مرد اور عورت، خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، آزاد اور اپنی مرضی کا مالک ہے۔ جنسی تعلق کے لیے اس پر جبر تو قابل مواخذہ اور

موجب تعزیر ہے، لیکن اگر دونوں باہم رضامندی سے یہ تعلق قائم کریں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ آئے دن ایسے واقعات میڈیا کی زینت بنتے رہتے ہیں جن میں ایک فریق کی طرف سے الزام لگایا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ زور زبردستی کی گئی ہے اور دوسرا فریق دعویٰ کرتا ہے کہ جنسی عمل باہم رضامندی سے انجام پایا ہے۔ جو واقعات قانون کی گرفت میں آ جاتے ہیں ان کے مقابلے میں ان واقعات کی تعداد بہت زیادہ ہے جو سماج کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر انجام پاتے ہیں۔ ظاہر ہے، جو جنسی تعلق باہم رضامندی سے قائم کیا جائے گا، دوسروں پر اس کا انکشاف شاذ و نادر ہی ہو پائے گا۔

آزادروی کی اس روش نے جنس کے معاملے میں متعدد منحرف اور غیر فطری رجحانوں کو جنم دیا ہے۔ مرد کا مرد سے جنسی تعلق (Homosexuality) اور عورت کی عورت سے جنسی تسکین (Lesbianism) اس سلسلے کی دو نمایاں مثالیں ہیں۔ دنیا میں ایسے انسان کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو جنسی تسکین کے ان غیر فطری طریقوں کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان کے مطالبات سے مجبور ہو کر بہت سے مغربی ممالک نے ان منحرف جنسی رجحانوں کو باقاعدہ قانونی جواز عطا کر دیا ہے اور ہم جنسی میں مبتلا جوڑوں کو ان تمام حقوق کی ضمانت دی ہے جو روایتی شادی شدہ جوڑوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے بہت سے ممالک اس سلسلے میں قانون کی تشکیل کے مختلف مراحل میں ہیں۔

آزادی اور افادیت کے تصورات نے ایک اور سماجی مسئلے کو جنم دیا ہے، جسے قائم مقام مادریت (Surrogate Motherhood) کا نام دیا گیا ہے۔ کہا گیا کہ عورت اپنی مرضی کی مالک ہے اور اپنے اعضائے جسم کی بھی۔ اس لیے اگر وہ چاہے تو اپنے رحم (Uterus) کو کرایہ پر اٹھا سکتی ہے۔ جو شادی شدہ عورت کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے، جس سے اس کے رحم میں استقرار حمل نہیں ہو سکتا یا وہ اپنی عیش پسندی کی وجہ سے حمل کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی اور بچے کی بھی خواہش رکھتی ہے، وہ کچھ پیسے خرچ کر کے کسی دوسری عورت کے رحم کو کرایہ پر لے سکتی ہے۔ اسی طرح اس تکنیک سے وہ عورتیں بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو شادی کے بندھن میں بندھے بغیر زندگی گزارتی ہیں اور فطری تقاضے سے کسی بچے کی پرورش کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی خواہش کی

تشکیل کے لیے مادۂ منویہ کی دوکانیں (Sperm Banks) قائم ہیں۔ وہ کسی من پسند شخصیت کے مادۂ منویہ (Sperm) کو خرید کر، کسی ٹیسٹ ٹیوب میں اپنے بیضہ (Ovum) کے ساتھ استقرار حمل کروا کے، کسی عورت کے رحم میں بہ صورت جنین اس کی پرورش کروا سکتی ہیں۔ دنیا کے متعدد ممالک میں اسے قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے۔ اس صورت حال میں بہت بڑی تعداد میں عورتوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا ہے اور اس کے ذریعے خاطر خواہ دولت کماتا ہے۔

عصر حاضر کا ایک اہم مسئلہ رحم مادر میں جنین کشی (Foeticide) کا ہے۔ اسے اگرچہ بسا اوقات قبل از نکاح جنسی تعلق کے نتیجے میں استقرار شدہ حمل کو زائل کرنے کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے، لیکن اس کا غالب استعمال اس صورت میں کیا جاتا ہے، جب بعد از نکاح استقرار حمل کے بعد الٹرا ساؤنڈ یا کسی دیگر تکنیک کے ذریعے معلوم کر لیا جاتا ہے کہ رحم میں لڑکی پرورش پا رہی ہے۔ اس سماجی رویے نے عالمی سطح پر سنگین صورت اختیار کر لی ہے، اس لیے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا تناسب کم ہو رہا ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان بھی اس سنگین مسئلے سے دو چار ہے۔

خاندان اور سماج کا ایک اہم جز بوڑھے ہوتے ہیں۔ ہر فرد اپنی عمر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بڑھاپے کو پہنچتا ہے۔ اس عمر میں اگرچہ اس کے جسمانی قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ دوسروں کا دست نگر بن جاتا ہے، لیکن اپنے قیمتی تجربات اور سرپرستی کے پہلو سے اس کی اہمیت نہ صرف باقی رہتی ہے بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ دور کے تصور افادیت نے انھیں ایک بے کار اور غیر مفید فرد کی حیثیت دے دی ہے۔ چنانچہ ان سے نجات پانے کے لیے Old Age Homes قائم کیے گئے ہیں۔ مغربی ممالک میں تو ایسے مراکز عام ہیں، جہاں فیس ادا کر کے یا مفت میں بوڑھے رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ان کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔

عورتوں کو ہر طرح کے حقوق سے بہرہ ور کرنے کے لیے ایک تحریک برپا کی گئی، جسے نسائیت (Feminism) کا نام دیا گیا۔ اس نے نعرہ دیا کہ عورت کو ہر حیثیت سے مرد کے مساوی مقام حاصل ہے اور وہ ہر وہ کام کر سکتی ہے جسے مرد انجام دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس تصور نے خاندان کے دونوں مرکزی ستونوں کو، جو حقیقت میں باہم رفیق اور حلیف تھے، ایک

دوسرے کا فریق اور حریف بنا دیا۔ جب عورت کو ہر حیثیت سے مرد کے مساوی مقام حاصل ہے تو وہ نظامِ خاندان میں مرد کی ماتحتی کیوں قبول کرے۔ ملازمت اور روزگار کے مواقع نے اسے خود کفیل بنا دیا اور مرد پر اس کا انحصار کم یا ختم ہو کر رہ گیا۔ اس کے نتیجے میں اس کی جانب سے سرکشی اور خودسری کا مظاہرہ ہونے لگا۔ دوسری طرف مرد نے اسے قابو میں کرنے کے لیے اپنے زور بازو کا استعمال شروع کر دیا۔ اس چیز نے گھریلو تشدد (Domestic Violence) کو جنم دیا، جو آج کل پوری دنیا کا ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔

ان مسائل کے بطن سے دیگر بہت سے سماجی مسائل نے جنم لیا ہے، جن کی وجہ سے نہ صرف خاندان کا روایتی نظام معرضِ خطر میں ہے اور اس کی بنیادیں متزلزل ہیں، بلکہ پورا انسانی سماج ان کی زد میں ہے اور ان کی مار جھیل رہا ہے۔ عالمی سطح پر بڑھتے ہوئے جرائم کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں اور ان کے اسباب و علل پر غور کریں تو ان کی جڑ میں یہی مسائل دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اخلاق و شرافت کا جنازہ نکل گیا ہے اور انسانوں کا معاشرہ خالص حیوانی سماج کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ جس طرح حیوانات جنس کے معاملے میں تمام حدود و قیود سے آزاد ہوتے ہیں، اسی طرح انسانوں کے درمیان بھی آزادی اور بنیادی حقوق کے نام پر تمام پابندیاں ختم کی جا رہی ہیں۔ جنسی آوارگی کی سزا قدرت نے ایڈز کی شکل میں دی ہے، جس سے دنیا کے تمام ممالک پریشان ہیں اور کروڑوں اربوں ڈالر خرچ کرنے اور بے شمار احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے باوجود اس موذی اور بھیانک مرض پر قابو پانے میں ناکام ہیں۔ جو لوگ ازدواجی تعلقات کے سلسلے میں ضابطوں کی پابندی کرتے ہیں ان کے درمیان بھی ایک دوسرے کے حقوق کی پامالی، ظلم و زیادتی، تشدد اور بے وفائی کے واقعات عام ہیں۔ اس کے نتیجے میں زوجین کے درمیان علیحدگی اور طلاق کے واقعات کثرت سے پیش آتے ہیں۔ نو عمر لڑکیوں کے اغوا اور ان کے ساتھ زنا بالجبر اور قتل کے واقعات اتنے زیادہ پیش آ رہے ہیں کہ ان کی سنگینی کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے۔ والدین اور اولاد کے درمیان مودت اور مرحمت کا تعلق کم زور سے کم زور تر ہوتا جا رہا ہے۔ والدین اگر اپنے نو عمر بچوں کو آزادی سے منع کرتے اور اخلاقی حدود میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ بغاوت پر اتر آتے ہیں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی ان کی

روک ٹوک کو انسانی آزادی میں مداخلت کا نام دے کر اسے قابل تعزیر جرم قرار دیتے تھے۔

عالمی سطح پر انسانی سماج کو درپیش ان مسائل نے دنیا کے تمام مفکرین، دانش وروں، سیاست دانوں، امن و قانون نافذ کرنے والے اداروں اور سماجی مصلحین کو پریشان کر رکھا ہے۔ انھیں کوئی راہِ عمل سجھائی نہیں دے رہی ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے اور ان کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے وہ نت نئی تدابیر اختیار کرتے ہیں، مگر مسائل ہیں کہ مزید الجھتے چلے جارہے ہیں۔ طرح طرح کے قوانین بناتے ہیں، مگر وہ ذرا بھی مؤثر ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔ فطرت سے بغاوت کا یہ انجام تو سامنے آنا ہی تھا اور اس کے کڑوے کسیلے پھلوں کا مزہ تو چکھنا ہی تھا۔

اسلام نے خاندان اور سماج کا جو تصور پیش کیا ہے وہ موجودہ دور کے ان تصورات سے قطعی مختلف ہے۔ اس نے انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ جنسی جذبہ کو اہمیت دی ہے۔ وہ نہ اسے دبانے اور کچلنے کا قائل ہے، نہ انسان کو بے مہار چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی تسکین کے لیے جو طریقہ چاہے اختیار کرے، بلکہ وہ اسے ایک مخصوص طریقہ کا پابند کرتا ہے، جس کا نام 'نکاح' ہے۔ اس کے ذریعہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق صحیح بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور خاندان کا ادارہ تشکیل پاتا ہے۔ اس کی نظر میں زنا صرف وہی نہیں، جس میں جبر واکراہ شامل ہو، بلکہ وہ بھی ہے جو طرفین کی رضا مندی سے ہوا ہو۔ نکاح کے بغیر جنسی تعلق قائم کرنا ہر حال میں حرام ہے، خواہ اس کا ارتکاب سماج کی نگاہوں کے سامنے ہو یا پوشیدہ اور اس میں طرفین کی مرضی شامل ہو یا نہ ہو۔ اس کے نزدیک ہم جنس پرستی شدید مبغوض شے اور موجب تعزیر جرم ہے، اس لیے کہ یہ انسان کے فطری داعیہ کے خلاف اور اس سے بغاوت ہے۔ اس کے نزدیک انسان اپنے اعضائے جسم کا مالک نہیں، بلکہ امین ہے، اس لیے مادۂ منویہ کو اسپرم بینک میں محفوظ کرنے اور رحم کو کرایے پر دینے کا اسے کوئی حق نہیں۔ اس کے نزدیک 'عفت وعصمت' اعلیٰ اخلاقی قدر اور بڑی قیمتی شی ہے، اس لیے اسے پامال کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ اس کے نزدیک اولاد شادی شدہ جوڑے کے لیے اللہ تعالیٰ کا انمول عطیہ ہے، اس لیے رحم مادر میں پرورش پانے والا جنین لڑکا ہو یا لڑکی، دونوں یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ اللہ نے روزی اور وسائل معاش فراہم کرنے کا ذمہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے، اس لیے کم افادیت یا عدمِ افادیت کے بہانے مادہ (Female)

جنین کا اسقاط کروانا جائز نہیں۔ اس کے نزدیک بوڑھے والدین خاندان کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں، اس لیے ان کی ہر طرح سے خدمت کرنا، ان کے لیے دیدہ و دل کو فرشِ راہ کرنا اور ان کی تنک مزاجی کو برداشت کرنا سعادت مند اولاد کا فریضہ ہے۔ اس نے نظامِ خاندان میں مرد اور عورت دونوں کے حقوق اور ذمہ داریاں تفصیل سے بیان کر دی ہیں اور مرد کو گھر چلانے کی اضافی ذمہ داری دے کر پابند کیا ہے کہ وہ عورت پر کسی طرح کا ظلم نہ کرے، ورنہ اس کی باز پرس ہوگی۔

خاندان اور سماج کی صحیح خطوط پر استواری کے لیے اسلام نے جو تعلیمات دی ہیں، اگر ان پر عمل کیا جائے تو وہ مسائل پیدا ہی نہیں ہوں گے، جن کا اوپر کی سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے، اس لیے کہ اللہ رب العالمین انسانوں کی ضروریات سے بھی واقف ہے اور ان کی فطرت سے بھی اچھی طرح آگاہ ہے، جس پر اس نے انھیں پیدا کیا ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب انسان اپنی فطرت سے بغاوت کرتے ہیں اور اس سے انحراف کر کے غلط راہوں پر جا پڑتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیمات محض خیالی اور نظریاتی نہیں ہیں، بلکہ ایک عرصہ تک دنیا کے قابلِ لحاظ حصے میں نافذ رہی ہیں اور سماج پر ان کے بہت خوش گوار اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اور اب بھی جن معاشروں میں ان پر عمل کیا جا رہا ہے وہ پاکیزگی، امن اور ہمدردی و رحم دلی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس لیے جو لوگ بھی موجودہ دور کے مذکورہ بالا سماجی مسائل سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ان کے برے اثرات اور پیچیدہ عواقب سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں، انھیں اسلام کی ان تعلیمات کو اختیار کرنے اور انھیں اپنے سماج میں نافذ کرنے کے لیے سنجیدہ کوشش کرنی چاہیے۔

آئندہ صفحات میں مذکورہ بالا سماجی مسائل کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے، عالمی اور ملکی دونوں سطحوں پر ان کی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ہے، ان کے اسباب و عوامل اور عواقب و اثرات بیان کیے گئے ہیں، ساتھ ہی ان کے تعلق سے اسلام کی تعلیمات واضح کی گئی ہیں۔

* * *

نکاح کے بغیر جنسی تعلق

خاندان کی اہمیت و افادیت عہد قدیم سے مسلّم رہی ہے اور اسے سماج کا ایک اہم ادارہ سمجھا گیا ہے۔ اسی بنا پر دنیا کی تمام تہذیبوں، ملکوں اور خطوں میں انسان خاندانی نظام کے تحت زندگی گزارتے رہے ہیں، لیکن موجودہ دور میں مختلف اسباب سے یہ ادارہ معرضِ خطر میں ہے۔ ان دنوں انسانیت جن سنگین مسائل سے دو چار ہے ان میں سے ایک خاندان کی تباہی و بربادی ہے۔ بے محابا آزادی، خود غرضی، مفاد پرستی، شہوت رانی، مادیت کے غلبے اور مال و دولت کی حرص نے اس مقدس ادارہ کو بری طرح شکست و ریخت سے دو چار کر دیا ہے، خاندان کی ذمہ داریوں سے فرار کی راہیں تلاش کی جا رہی ہیں، یہاں تک کہ اب اس کی ضرورت سے بھی انکار کیا جانے لگا ہے۔

اس رجحان کو اصطلاحی طور پر Live in Relationship یا Cohabitation کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی مرد اور عورت کا ایک ساتھ رہتے ہوئے زندگی گزارنا۔ اس کا اطلاق ان جوڑوں پر کیا جاتا ہے جو نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہنے لگیں۔ ان کی یہ معاشرت عارضی اور چند روزہ بھی ہو سکتی ہے اور اس میں پائیداری بھی ممکن ہے کہ وہ طویل زمانے تک ایک ساتھ رہیں۔ اس عرصے میں ان کے درمیان جنسی تعلق بھی قائم رہتا ہے، جس کے نتیجے میں بسا اوقات بچے بھی ہو جاتے ہیں، لیکن میاں بیوی کی طرح رہنے کے باوجود ان کے درمیان نکاح کا معاہدہ نہیں ہوتا، جس کی بنا پر ان میں سے ہر ایک کو اختیار رہتا ہے کہ جب بھی اس کی مرضی ہو، علیحدگی اختیار کر لے۔ نکاح نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ساتھی کے تعلق سے ہر طرح کی ذمہ داریوں سے آزاد رہتا ہے اور اس پر کوئی قانونی بندش نہیں ہوتی۔

عالمی صورتِ حال

نصف صدی قبل تک دنیا کے بیش تر حصوں میں نکاح کے بغیر جنسی تعلق کو سخت ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا اور زیادہ تر ممالک کے دستوروں اور قوانین میں اسے غیر قانونی قرار دیا گیا تھا، لیکن اس کے بعد صورت حال بہت تیزی سے تبدیل ہونے لگی اور خاندان کی پابندیوں سے آزاد رہ کر زندگی گزارنے کا رجحان پرورش پانے لگا، جس میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب اس نے انتہائی خطرناک اور بھیانک صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کا اندازہ اس سلسلے میں مختلف ممالک کے بارے میں جاری ہونے والے اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

امریکا میں ۱۹۶۰ء سے قبل تقریباً چار لاکھ پچاس ہزار جوڑے بغیر نکاح کے ایک ساتھ رہتے تھے۔ ۲۰۰۰ء تک ایسے لوگوں کی تعداد میں دس گنا اضافہ ہو گیا، یہاں تک کہ ۲۰۱۱ء میں ان کی تعداد تقریباً ساڑھے سات ملین تک پہنچ گئی۔ ۲۰۰۹ء میں U.S. Census Bureau نے American Community Survey کروایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیس (۳۰) سے چوالیس (۴۴) سال کی درمیانی عمر کے مرد اور خواتین، جو نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہتے ہیں، ان کا تناسب ۱۹۹۹ء میں چار (۴) فی صد تھا، جو اب سات (۷) فی صد ہو گیا۔ خواتین کا الگ سے کیے جانے والے سروے کا نتیجہ یہ تھا کہ انیس (۱۹) سے چوالیس (۴۴) سال کی درمیانی عمر کی ایسی خواتین جو نکاح کے بغیر کسی مرد کے ساتھ رہتی ہوں، ان کا تناسب ۱۹۸۷ء میں تینتیس (۳۳) فی صد تھا، جو اب بڑھ کر اٹھاون (۵۸) فی صد ہو گیا۔ برطانیہ کے Office for National Statistics کے مطابق وہاں ۲۰۱۲ء میں بغیر نکاح کے ایک ساتھ رہنے والے جوڑوں کی تعداد 9.5 ملین تھی، جو ۱۹۹۶ء میں ان کی تعداد کی دوگنی تھی۔ یہی حال یورپی ممالک کا ہے۔ ۲۰۱۱ء میں یورپی یونین کے ستائیس (۲۷) ممالک میں پیدا ہونے والے بچوں میں 39.5 فی صد ایسے تھے جن کی ولادت بغیر نکاح کے جنسی تعلق کے نتیجے میں ہوئی تھی۔

یہ وبا مغربی ممالک کے ساتھ اب مشرقی ممالک میں بھی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ جاپان کے ادارے National Institute of Population and

Social Security Research کے مطابق پچیس (۲۵) سے انتیس (۲۹) سال کی درمیانی عمر کی خواتین کی تقریباً تین (۳) فی صد تعداد اس وقت جاپان میں بغیر نکاح کے مردوں کے ساتھ رہ رہی ہے اور بیس (۲۰) فی صد خواتین ایسی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی بغیر نکاح کے جنسی تعلق کا تجربہ کیا ہے۔ فلپائن میں ۲۰۰۳ء میں بیس (۲۰) سے چوبیس (۲۴) سال کی درمیانی عمر کے تقریباً ڈھائی ملین افراد (مرد و خواتین) بغیر نکاح کے ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ Live in Relationship اختیار کرنے والے جوڑوں کا تناسب آسٹریلیا میں ۲۰۰۵ء میں وہاں کی آبادی کا بائیس (۲۲) فی صد اور نیوزی لینڈ میں ۲۰۰۱ء میں وہاں کی مجموعی آبادی کا اٹھارہ (۱۸) فی صد تھا[1] یہ صرف چند ممالک کے اعداد و شمار ہیں۔ دیگر ممالک کا حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

ہندوستان کا حال

ہندوستان زمانۂ قدیم سے ایک مذہبی اور اخلاقی روایات کا احترام کرنے والا ملک رہا ہے۔ یہاں مختلف مذاہب، اقوام و قبائل اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے بستے ہیں۔ یہ سب خاندانی نظام کے قائل رہے ہیں۔ ان کے نزدیک نکاح کو اعتبار و استناد حاصل رہا ہے اور اس کے بغیر جنسی تعلق کو سخت ناپسندیدہ اور گھناؤنا کام سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن اباحیت، فحاشی اور آوارگی میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے اب یہاں بھی Live in Relationship کو گوارا کیا جانے لگا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کی شناعت کے احساس میں کمی آگئی ہے، بلکہ اس کو قانونی جواز دینے کی باتیں بھی کی جانے لگی ہیں۔

ہندوستان میں کتنے جوڑے بغیر نکاح کے ایک ساتھ رہتے ہیں؟ اس کے اعداد و شمار دست یاب نہیں ہیں، لیکن مختلف رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رجحان یہاں بہت تیزی سے فروغ پا رہا ہے اور خاص طور سے میٹرو شہروں میں رہنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

( ) ملاحظہ کیجیے wikipedia.org/wiki/cohabitation

ہندوستان کی پارلیمنٹ کا رجحان بھی اس کی خاموش تائید وحمایت کی طرف ہے اور یہاں کی عدالتیں اسے قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ خواتین کو گھریلو تشدد سے محفوظ رکھنے کے لیے ۲۰۰۵ء میں ایک قانون منظور کیا گیا، جسے Protection of Women from Domestic Violence Act کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے دائرے میں ان خواتین کو بھی شامل کیا گیا ہے جو بغیر نکاح کے مردوں کے ساتھ رہتی ہوں۔ ان کے باہمی جنسی تعلق کو Relationship in the Nature of Marriage (نکاح کی نوعیت کا تعلق) قرار دیا گیا ہے۔ اس قانون میں ایسی عورتوں کو، ان پر گھریلو تشدد ہونے کی صورت میں، بعض مالی اور دیگر سہولیات کی ضمانت دی گئی ہے۔

سپریم کورٹ کی ایک بنچ نے ۲۳/ مارچ ۲۰۱۰ء میں S.Khushboo vs Kanniammal کے کیس میں یہ رولنگ دی کہ بالغ مرد اور عورت بغیر نکاح کے بھی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فاضل ججوں نے ساتھ ہی اپنے ان احساسات کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھا:

> "When two adult People want to live togather, what is offence? Does it amount an offence? Living togather is not an offence. It can not be an offence"

> ”اگر دو جوان (مرد اور عورت) ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو اس میں جرم کیا ہے؟ یہ معاملہ جرم تک کہاں پہنچتا ہے؟ ایک ساتھ رہنا جرم نہیں ہے۔ یہ جرم ہو بھی نہیں سکتا“۔

۱۳/ اگست ۲۰۱۰ء کو Madan Mohan singh vs Rajni Kant کیس میں سپریم کورٹ کی ایک بنچ نے یہ رائے دی کہ کوئی مرد اور عورت اگر لمبے عرصے تک بغیر نکاح کے ایک ساتھ رہیں تو ان کے تعلق کو نکاح پر مبنی تعلق کے مثل مانا جاسکتا ہے۔ ایک دوسرے کیس (Bharata Matha vs R.Vijaya) میں سپریم کورٹ کی ایک بنچ نے فیصلہ دیا کہ Live in Relationship کے نتیجے میں اگر کوئی اولاد ہوتی ہے تو اسے اپنے باپ اور ماں دونوں کی جانب سے وراثت کے حقوق حاصل ہوں گے۔

سپریم کورٹ کی ایک بنچ نے ۲۱/ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو D. Velusamy vs D. Patchaiammal کے کیس میں رائے دی کہ Demestic Violence Act 2005 کے تحت درج ذیل شرائط پوری کرنے پر دو افراد کے Live in Relationship کو نکاح کی حیثیت دی جاسکتی ہے:

(۱) وہ دونوں سماج کی نگاہوں میں میاں بیوی کی طرح رہتے ہوں۔

(۲) وہ اس عمر کو پہنچ گئے ہوں جو قانونی طور پر نکاح کے لیے ضروری قرار دی گئی ہے۔

(۳) بغیر نکاح کے ساتھ رہتے ہوئے وہ اس لائق ہوں کہ ان کے درمیان قانونی طور پر نکاح ہو سکتا ہو۔

(۴) وہ رضا کارانہ طور پر ایک ساتھ رہتے ہوں اور انھوں نے ایک قابل لحاظ مدت تک مشترکہ رہائش اختیار کی ہو۔(۱)

اس تفصیل سے ہندوستانی عدلیہ کے رجحان کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس طرح Live in Relationship کو نکاح جیسی قانونی حیثیت دینے کے لیے بے تاب ہے۔

اسباب اور قائلینِ جواز کے دلائل

خاندان کی قید و بند سے فرار اور بغیر نکاح کے آزادانہ رہن سہن کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ اس رجحان کی حمایت کرتے ہیں اور اسے قانونی حیثیت دینے کے لیے کوشاں ہیں وہ اس کے مختلف دلائل پیش کرتے ہیں۔ ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

(۱) جس مرد اور عورت کا آپس میں نکاح ہوتا ہے، ان کے درمیان عموماً پہلے سے تعارف نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بہت معمولی۔ وہ ایک دوسرے کی عادات و اطوار، مزاج، رہن سہن کے انداز اور دیگر باتوں سے واقف نہیں ہوتے۔ بغیر نکاح کے ساتھ رہنے کا مقصد ایک دوسرے سے تفصیلی واقفیت حاصل کرنا اور یہ جائزہ لینا ہوتا ہے کہ کیا وہ آئندہ زندگی ایک ساتھ رہ کر گزار سکتے ہیں؟ بعض سروے رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر نکاح کے ایک ساتھ

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے wikipedia.org/wiki/cohabitation_in_India

رہنے والے افراد میں سے تین چوتھائی سے زیادہ یہی کہتے ہیں کہ نکاح سے قبل ان کا ساتھ رہنا نکاح کا پیش خیمہ ہے۔

(۲) نکاح کے بندھن میں بندھ کر اگر کوئی مرد اور عورت ایک ساتھ زندگی گزاریں گے تو کچھ عرصہ کے بعد ناپسندیدگی یا کسی اور وجہ سے الگ ہونے میں قانونی رکاوٹیں اور رواجی بندشیں ہوں گی۔ اس سے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ بغیر نکاح کے وہ ایک ساتھ رہیں اور جب ان کا جی بھر جائے، ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں اور اپنی اپنی راہ لیں۔

(۳) کچھ لوگوں کی آمدنی محدود ہوتی ہے یا وہ اپنی معاشیات کے بارے میں غیر یقینی صورت حال سے دوچار رہتے ہیں۔ وہ شادی میں تاخیر کرتے ہیں، یا بسا اوقات شادی ہی نہیں کرتے۔ اس لیے کہ وہ نکاح کے مصارف برداشت کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں، یا انھیں اندیشہ رہتا ہے کہ اگر نکاح کے بعد رشتہ پائیدار نہ رہ سکا اور اس کا طلاق پر خاتمہ ہوا تو وہ مالی مشکلات کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ لوگ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ نکاح کے بغیر صنف مخالف کے ساتھ کچھ وقت گزار لیں۔

(۴) بعض نوجوان لڑکے یا لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے حصول یا ملازمتوں کے لیے وطن سے دور کہیں عارضی طور پر مقیم ہوتے ہیں اور مختلف اسباب سے ان کے لیے ابھی نکاح کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہنے لگتے ہیں۔

(۵) کوئی شخص شادی شدہ ہو اور وہ کسی وجہ سے دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہو، لیکن قانون پہلی بیوی کے رہتے ہوئے دوسرے نکاح کی اجازت نہ دیتا ہو تو وہ بغیر نکاح کے دوسری عورت کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔

(۶) کچھ مرد اور خواتین نکاح کو فرسودہ روایت سمجھتے ہیں اور خود کو اس کا اسیر نہیں بنانا چاہتے۔ وہ اسی چیز کو دانش مندی سمجھتے ہیں کہ نکاح کے بندھن میں بندھے بغیر جس کے ساتھ چاہیں کچھ وقت گزار لیں اور جب اس سے جی بھر جائے تو اسے چھوڑ کر دوسرے سے رشتہ استوار کر لیں۔

نظامِ خاندان۔ فطرت کا تقاضا

حقیقت یہ ہے کہ انسانی فطرت خاندانی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا تقاضا کرتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام انسانی معاشرے اس پر عمل پیرا رہے ہیں اور موجودہ دور کی اباحیت پسند اور مادہ پرست تہذیب کے غلبے سے قبل کسی نے اس کا انکار نہیں کیا ہے اور نظامِ خاندان کو کمزور کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

نسلِ انسانی کی بقا اور تسلسل کے لیے ضروری ہے کہ مرد اور عورت کا صنفی تعلق پائیدار بنیادوں پر قائم ہو۔ دونوں محض اپنی شہوانی خواہش کی تکمیل اور حصولِ لذت کے لیے باہم ملنے، پھر الگ ہو جانے کے معاملے میں آزاد نہ ہوں، بلکہ ان کے درمیان ایسا مستحکم تعلق ہو جو معاشرہ میں معروف ہو اور اس کے تحفظ کی ضمانت بھی دی گئی ہو۔ اس لیے کہ ان سے جو اولاد ہوگی وہ اپنی زندگی، نگہداشت اور تربیت کے لیے بہت زیادہ توجہ، نگرانی، خبر گیری اور سرپرستی چاہتی ہے۔ اس کام میں اگر مرد ساتھ نہ دے تو تنہا عورت اسے صحیح طریقے سے انجام نہیں دے سکتی۔

اسی مقصد کے لیے فطرت نے مرد اور عورت کے درمیان صنفی کشش رکھی ہے۔ اسی غرض سے وہ باہم ملتے ہیں، پھر جب اولاد ہوتی ہے تو دونوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔ دونوں مل کر اس کی پرورش کرتے ہیں، اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں اور اسے زندگی کی دوڑ دھوپ کے قابل بناتے ہیں۔

نکاح کے بغیر جنسی تعلق سے فطرت کے یہ تقاضے پامال ہوتے ہیں، اس لیے کہ اس سے محض لذت کوشی اور شہوانی جذبات کی تسکین مقصود ہوتی ہے، نسلِ انسانی کا تسلسل پیشِ نظر نہیں ہوتا اور اگر اتفاقاً حمل ٹھہر جائے اور بچہ پیدا ہو جائے تو مرد اس کی سرپرستی قبول کرنے اور اس کی تربیت و کفالت کا بار اٹھانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

تمدن کی ترقی خاندانی نظام پر منحصر ہے

خاندانی نظام اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر تمدن کی ترقی ممکن نہیں۔ تمدن کا وجود ہی اس وقت ہوتا ہے جب ایک مرد اور عورت مل کر ایک گھر بناتے اور خاندان کی تشکیل کرتے ہیں۔ اولاد ہوتی ہے اور خاندان وسیع ہوتا ہے تو اس کے دائرے میں والدین اور دوسرے رشتے دار آ جاتے ہیں۔ بہت سے خاندان وجود میں آتے ہیں اور ان کے درمیان

رابطے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اجتماعی زندگی شروع ہوتی ہے اور تمدن پروان چڑھتا ہے۔ لیکن اگر مردوں اور عورتوں پر خود غرضی اور انفرادیت پسندی غالب رہے اور وہ خود کو محض اپنے شہوانی جذبات کی تسکین اور لطف و لذت کی تحصیل تک محدود رکھیں اور خاندان کی تشکیل سے دل چسپی نہ لیں تو اجتماعی زندگی کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے اور وہ بنیاد ہی باقی نہیں رہتی جس پر تمدن کی عمارت قائم ہو سکے۔

خاندان انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے

خاندان انسانی زندگی کا خاصہ ہے۔ وہ انسانوں کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔ حیوانات میں بھی جنسی جذبات پائے جاتے ہیں، جن کے تحت ان کے نر اور مادہ ملتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بچے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی نسل چلتی ہے۔ لیکن حیوانات میں جنسی اتصال کے بعد ان کے نر کا مادہ اور اور بچے سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، یا اگر رہتا ہے تو بہت کم زور سا۔ مادہ اپنی نئی نسل کی پرورش اور حفاظت کرتی ہے، وہ بھی صرف اس حد تک کہ وہ زندہ رہ سکے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس انسانوں کے باہمی رشتے میں پائیداری پائی جاتی ہے۔ مرد اور عورت بامقصد طریقے پر جنسی تعلق قائم کرتے ہیں۔ ان سے جو اولاد ہوتی ہے، دونوں مل کر طویل عرصے تک اس کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں۔ ان کے درمیان الفت و محبت، ہمدردی آخر تک قائم رہتی ہے۔ وہ دوسروں کے حقوق کی پاس داری اور اپنی ذمہ داریوں کی ادائی کا خیال رکھتے ہیں۔

انسانوں میں جو لوگ اپنے تعلقات کو صرف جنسی جذبہ کی تسکین تک محدود کر لیتے ہیں اور خاندان کی تشکیل اور اپنی نسل کی پرورش و نگہداشت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، وہ حقیقت میں خود کو انسانیت کے بلند مرتبے سے حیوانیت کے پست درجے میں گرا لیتے ہیں۔

عورت کا سراسر خسارہ

بچے کی پیدائش اور پرورش و پرداخت میں عورت کا کردار مرد سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ مرد کا کام اصلاً صرف تخم ریزی ہے۔ جنسی تعلق قائم کر کے وہ الگ ہو جاتا ہے، آگے کے

تمام مراحل عورت کو تنہا سر انجام دینے پڑتے ہیں۔ وہ نو مہینے بچے کو اپنے پیٹ میں رکھتی اور اپنے خون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ وضع حمل کے بعد دو سال تک مسلسل اسے اپنا دودھ پلاتی ہے۔ بچہ انتہائی کم زور اور لاغر پیدا ہوتا ہے اور بھرپور نگہ داشت کا محتاج ہوتا ہے، وہ اپنا آرام و سکون تج کر جی جان سے اس کی نشوونما میں لگی رہتی ہے۔ اسے یہ خدمت طویل عرصے تک انجام دینی پڑتی ہے۔ معاہدۂ نکاح کے نتیجے میں مرد کا عورت اور بچے سے تعلق مسلسل قائم رہتا ہے۔ وہ عورت کو ہر ممکن مدد اور تعاون فراہم کرتا ہے، اس کی کفالت کا بار اٹھاتا ہے، اس کی ضروریات پوری کرتا ہے، اس کی سرپرستی اور نگرانی میں عورت سکون و اطمینان کے ماحول اور الفت و محبت کی فضا میں اپنے کارہائے مفوضہ انجام دیتی ہے۔ دونوں مل کر بچے کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تربیت کرتے ہیں۔ اگر نکاح کا مضبوط بندھن نہ ہو تو مرد بہ طیب خاطر اس ذمہ داری کو قبول نہیں کر سکتا اور اگر وہ اس سے انکار کردے تو کسی طرح بھی اسے اس کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اس صورت میں عورت کا سراسر خسارہ ہے۔ مرد تو چند لمحات اس کے ساتھ گزار کر الگ ہو جائے گا اور وہ ساری مشقتیں اور پریشانیاں تنہا جھیلنے کے لیے مجبور ہوگی۔ ماہرین سماجیات نے اس بے اعتدالی، ناانصافی اور ظلم کو محسوس کیا ہے اور اس پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر پارول شرما نے Live in Relationship کے بارے میں ملکی اور بین الاقوامی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد آخر میں اپنے احساسات ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

> ''یہ ایک حساس مسئلہ ہے۔ لوگ اب بڑی تعداد میں Live in Relationship کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور مختلف اسباب سے اس طریقے معاشرت کو رواج مل رہا ہے، لیکن نوجوان نسل، خاص طور پر مرد اس 'رشتہ' کو سنجیدگی سے نہیں لیتے اور زندگی کے خوش گوار ایام آنے سے قبل ہی اپنے ساتھی سے بے وفائی کر بیٹھتے ہیں اور اس سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ مایوسی، غصہ اور ذہنی دباؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور معاملہ بسا اوقات خودکشی تک جا پہنچتا ہے۔''(۱)

---

(۱) VSRD International Journal of Technical and Non- Technical Research, Vol.IV, Issue VIII, August 2013, Article: Live in Relationship, A Comparative Approach, by Parul Solanki Sharma, Asstt. Prof. School of Law, FIMT, GGSIPU, New Delhi, p.199

بے قید معاشرت کے تلخ نتائج

نکاح ایک مضبوط بندھن ہے، جو مرد، عورت، بچوں اور خاندان کے دیگر افراد کو ایک دوسرے سے مربوط رکھتا ہے۔ ان کے درمیان محبت، ایثار، ہم دردی، خیر خواہی اور تعاون کے جذبات پروان چڑھاتا ہے۔ انھیں ایک دوسرے کی مدد کرنے، ان کی ضروریات پوری کرنے اور ان کے کام آنے پر ابھارتا ہے۔ یہ بندھن نہ ہو تو افراد خود غرضی، ذاتی مفاد اور مطلب براری کے لیے ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں اور اپنی ضرورت پوری ہوتے ہی ایک دوسرے سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کو صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے اور دوسرے کا استحصال کرتے ہوئے اسے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ اس صورت حال سے سب سے زیادہ متاثر وہ بچے ہوتے ہیں جو بے قید جنسی تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی صحیح ڈھنگ سے پرورش نہیں ہو پاتی، وہ اچھی تربیت، عمدہ اخلاق اور صحیح خطوط پر شخصیت کی تعمیر سے محروم رہتے ہیں، گھر کا سکون اور خاندان کی پر امن فضا انھیں میسر نہیں آتی۔ اس بنا پر وہ سماج میں انتشار، فواحش و منکرات اور بے حیائی پھیلنے کا باعث بنتے ہیں۔ الغرض بے قید معاشرت کے نتیجے میں تمدن کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے، افراد کی زندگیاں تلخ ہو جاتی ہیں اور پورا معاشرہ دائمی اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آج پوری دنیا میں اور خاص طور پر مغربی معاشروں میں ہم اس کا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

موہوم فائدے

نظامِ خاندان کی مخالفت کرنے والے اور بغیر نکاح کے جنسی تعلق کو جواز فراہم کرنے والے اس کے جو فائدے بیان کرتے ہیں وہ موہوم اور خیالی ہیں، ان کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن بالفرض اگر انھیں تسلیم کر لیا جائے تو تمدن پر اس کے جو دور رس اور بھیانک اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ بڑے عبرت انگیز اور تشویش ناک ہیں۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے اور اس رجحان کو ختم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ -جیسا کہ عرض کیا گیا- یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نکاح سے قبل

ایک ساتھ رہنے سے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے اگر کچھ عرصہ ایک ساتھ گزار کر نکاح کیا جائے گا تو اس رشتے میں پائیداری رہے گی لیکن یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ National Centre for Health Statistics نے بارہ ہزار پانچ سو اکہتر (۱۲،۵۷۱) افراد کی اسٹڈی کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو مرد اور عورت اس ارادے سے ایک ساتھ رہے کہ آئندہ نکاح کرلیں گے، یا رشتہ طے ہوجانے کے بعد نکاح سے قبل انھوں نے کچھ وقت ایک ساتھ گزارا، ان میں علیحدگی کے امکانات اتنے ہی رہے جتنے ان جوڑوں میں تھے جنھوں نے نکاح سے قبل ایک ساتھ زندگی نہیں گزاری تھی۔(۱)

اسلام کا نقطۂ نظر

اسلام نظام خاندان کا حامی ہے، اس لیے وہ اسے مستحکم کرنے کی مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے اور اسے کمزور کرنے والے اسباب کو دفع کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ ذیل میں اسلام کے نقطۂ نظر کی کسی قدر وضاحت کی جا رہی ہے:

خاندان اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے

اسلام خاندان کو ایک سماجی ضرورت ہی نہیں قرار دیتا، بلکہ اس کا ایک دینی تقاضے کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔ قرآن میں صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جو پیغمبر بھیجے ہیں انھوں نے خاندانی زندگی گزاری ہے اور اس کے تقاضے پورے کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً

(الرعد: ۳۸)

”تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا۔“

---

(۱) Jayson, Sharon, "Report: Cohabiting has little effect on marriage Success", USA Today, October 14,2010

وہ بیوی بچوں کو انسان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیتا ہے۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندوں کی زبانی یہ دعا کرنے کی تلقین کی گئی ہے:

> رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا
> لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا ۝ (الفرقان: ۷۴)

> ”اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔“

آباد خاندان، جس میں بیوی، لڑکے لڑکیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور دیگر رشتے دار ہوں اور آدمی ان کے درمیان رہ کر خوشی و مسرت، سکون و اطمینان اور کیف و فرحت محسوس کرے، اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جس پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔ قرآن کہتا ہے:

> وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ
> أَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ أَفَبِالْبَاطِلِ
> يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝ (النحل: ۷۲)

> ”اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے تمھاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمھیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمھیں کھانے کو دیں۔ پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔“

نکاح جنسی تعلق کا واحد جائز ذریعہ

اسلام نے مرد اور عورت کے جائز اور صحت مند تعلق کے لیے نکاح کو لازم قرار دیا ہے۔ وہ نہ تو رہبانیت کی ہمت افزائی کرتا ہے اور نہ جنسی تسکین کی کھلی چھوٹ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک نکاح کے ذریعے ایک مضبوط خاندان وجود میں آتا ہے، جس کے تمام افراد میں ذمہ داری کا احساس پایا جاتا ہے اور وہ اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق سے غفلت نہیں برتتے۔ اس

لیے وہ نکاح کی ترغیب دیتا ہے اور افراد، خاندان اور معاشرہ کو صریح الفاظ میں اس کی تاکید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ ... (النور: ۳۲)

"تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں ان کے نکاح کردو....."

'ایامیٰ' جمع ہے، جس کا واحد 'ایّم' ہے۔ اس کا اطلاق اس مرد پر ہوتا ہے جو بغیر بیوی کے ہو اور اس عورت پر ہوتا ہے جو بغیر شوہر کے ہو، خواہ ابھی ان کا نکاح ہی نہ ہوا ہو یا نکاح کے بعد عورت بیوہ ہو گئی ہو اور مرد کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہو۔(۱)

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے سخت الفاظ میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

من قدر علی ان ینکح، فلم ینکح، فلیس منا۔(۲)

"جو شخص نکاح کرنے پر قادر ہو، پھر بھی نکاح نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔"

اسلام جنسی خواہش کی تکمیل کو نکاح کا پابند بناتا ہے اور نکاح سے ہٹ کر کسی طرح کا تعلق رکھنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ وہ مردوں اور عورتوں دونوں پر سخت پابندی عائد کرتا ہے کہ نکاح کے علاوہ وہ باہم کسی طرح کا جنسی تعلق نہ رکھیں۔ قرآن میں ہے:

مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ (المائدۃ: ۵)

"اس طرح کہ تم (مرد) ان (عورتوں) سے باقاعدہ نکاح کرو۔ یہ نہیں کہ علانیہ زنا کرو، یا پوشیدہ بدکاری کرو۔"

مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ (النساء: ۲۵)

"وہ عورتیں پاک دامن ہوں، نہ کہ علانیہ بدکاری کرنے والیاں، نہ خفیہ آشنائی کرنے والیاں۔"

ان آیات میں وارد تینوں الفاظ قابل غور ہیں۔ حصن کے معنی محفوظ ہونے کے ہیں، حِصن قلعہ کو کہتے ہیں، جو دشمنوں سے حفاظت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اِحصان پاک دامن رہنے اور

---

(۱) زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل: ۳/ ۲۲۷۔ رازی، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر: ۲۳/ ۱۸۳

(۲) سنن دارمی، کتاب النکاح، باب الحث علی التزویج

بدکاری سے محفوظ ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ گویا نکاح کی حیثیت ایک مضبوط قلعے کی ہوتی ہے، جس کے حصار میں آ کر انسان شیطان کے حملوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسی معنی میں مردوں کے لیے 'مُحصنین' اور عورتوں کے لیے 'مُحصنات' کا استعمال ہوتا ہے۔ سَفح کے معنی کوئی سیال چیز (مثلاً خون، پانی، آنسو یا منی وغیرہ) بہانے کے ہیں۔ مُسَافحۃ بغیر نکاح کے کسی مرد اور عورت کے ایک ساتھ رہنے کو کہتے ہیں۔ خِدن (جمع اَخدَان) کے معنی دوست کے ہیں۔ مُسَافِحِین / مُسَافِحَات ان مردوں اور عورتوں کو کہتے ہیں جو علانیہ بدکاری کا ارتکاب کریں اور مُتَّخِذِی اَخدَان / مُتَّخِذَاتِ اَخدَان انھیں کہتے ہیں جو پوشیدہ طریقے پر اس میں مبتلا ہوں۔ ایک فرق یہ بیان کیا گیا ہے کہ مُسَافحۃ میں بہت سے افراد سے بدکاری کے معنی پائے جاتے ہیں اور اِتِّخَاذ خِدن (دوست رکھنا) یہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت کسی ایک فرد کے ساتھ ناجائز تعلق رکھے۔(۱)

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

> "بیش تر مفسرین نے کہا ہے: مُسَافحۃ اس عورت کو کہتے ہیں جو علانیہ خود کو بدکاری کے لیے پیش کرے کہ جو مرد بھی چاہے آ کر اس سے جنسی تعلق قائم کرے اور مُتَّخِذَۃ الخِدن وہ عورت ہے جو کسی ایک ہی فرد سے ناجائز جنسی تعلق استوار رکھے۔ اہلِ جاہلیت دونوں قسموں کے درمیان فرق کرتے تھے۔ وہ بہت سے مردوں سے بدکاری کرنے والی عورت کو تو زانیہ مانتے تھے، لیکن کسی ایک مرد سے جنسی تعلق رکھنے والی عورت کو زانیہ نہیں مانتے تھے۔ چوں کہ یہ فرق ان کے درمیان معروف اور معتبر تھا اس لیے اللہ سبحانہ نے بدکاری کی ان دونوں قسموں کا الگ الگ تذکرہ کیا اور دونوں کو حرام قرار دیا۔" (۲)

زنا کی حرمت

نسلِ انسانی کے تسلسل اور تمدن کی ترقی، دونوں کے لیے ضروری ہے کہ مرد اور عورت کا

---

(۱) قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۵ / ۹۲

(۲) التفسیر الکبیر، تفسیر سورۂ نساء، آیت: ۲۵

جنسی تعلق قانون کے دائرے میں اور قابل اعتماد رابطے تک محدود ہو۔ اسی لیے اسلام زنا کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ وہ فعل ہے جس کی اگر آزادی دے دی جائے تو ایک طرف نسل انسانی کا تسلسل دشوار ہو جائے اور دوسری طرف تمدن کی جڑ کٹ جائے۔ اس بنا پر وہ اسے سخت گھناؤنا اور برا فعل قرار دیتا ہے اور اس سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاۗءَ سَبِيْلًا ○ (الاسراء:٣٢)

"اور زنا کے قریب نہ جاؤ۔ بلاشبہ وہ بڑی بے شرمی کا کام اور برا راستہ ہے۔"

'فاحشہ' اس برائی کو کہتے ہیں جس کی شناعت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہو۔(١)

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ 'زنا کے قریب نہ جاؤ'۔ اس میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔ گویا کہا جا رہا ہے کہ نہ صرف یہ کہ زنا کا ارتکاب نہ کرو، بلکہ ان تمام دواعی و محرکات سے بھی دور رہو جو زنا تک لے جانے والے ہوں۔(٢)

اسلام زنا کو ایک سنگین سماجی جرم قرار دیتا ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سخت سزا تجویز کرتا ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ

(النور:٢)

"زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔"

بغیر نکاح کے باہم رضامندی سے بھی جنسی تعلق کی اجازت نہیں

مغربی ممالک کے قوانین، جنھیں اب دنیا کے بیش تر ممالک نے تسلیم کر لیا ہے اور عالمی رائے عامہ کا بھی ان پر تقریباً اتفاق ہو گیا ہے، ان کے مطابق اگر بغیر نکاح کے جنسی تعلق فریق مخالف کی رضامندی سے قائم کیا جائے تو وہ قابل تعزیر جرم نہیں ہے۔ اسے جو چیز جرم بناتی ہے وہ

---

(١) الکشاف: ٢/ ٦٣٨ (فاحشة) قبيحة زائدة على حد القبح. شوکانی، فتح القدیر۔ أی قبیحاً متبالغاً فی القبح مجاوزاً للحد

(٢) قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ١٠/ ٢٦٥

جبر اور زور زبردستی ہے۔ ۲۰۱۲ء کے اواخر میں ہندوستان کے دار الحکومت دہلی میں ایک طالبہ کے ساتھ اجتماعی آبرو ریزی کا واقعہ پیش آیا۔ اس پر پورے ملک میں زبردست احتجاجی مظاہرے ہوئے اور سماج کے تمام طبقات نے اس کی شدید مذمت کی، خاص طور سے حقوقِ نسواں کی تنظیموں اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی اسٹوڈینٹس یونینوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس دوران میں لڑکیوں کے ہاتھوں میں ایسے پلے کارڈس (Play Cards) دیکھے گئے جن پر لکھا ہوا تھا: 'تم میری مرضی کے بغیر مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے'۔ گویا کسی لڑکے کا کسی لڑکی سے جائز رشتے کے بغیر اس سے جنسی تعلق قائم کرنا جرم نہیں ہے، بلکہ جرم یہ ہے کہ اس کام کے لیے اس کی رضا مندی کیوں نہیں حاصل کی گئی اور اس کے ساتھ زور زبردستی کیوں کی گئی۔

اسلام کی نظر میں جتنا سنگین جرم زنا بالجبر ہے اتنا ہی سنگین جرم زنا بالرضا بھی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو لوگ بغیر نکاح کے جنسی تعلق قائم کرتے ہیں وہ قوانینِ فطرت سے کھلواڑ کرتے ہیں اور نظامِ تمدن میں انتشار و اضطراب کا باعث بنتے ہیں، اس لیے وہ بھی سزا کے مستحق ہیں۔

خاندان کے استحکام کی دیگر تدابیر

اسلام نے خاندان کے استحکام کے لیے اور بھی بہت سی تدابیر اختیار کی ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس نے میاں بیوی، اولاد، والدین اور دیگر رشتہ داروں کے حقوق بیان کیے ہیں اور سب کو ان کی ادائی کا پابند کیا ہے۔ اس نے معاشرہ کی عفت و پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے متعدد احتیاطی احکام دیے ہیں اور بدکاری، بے حیائی اور فواحش و منکرات کو رواج دینے والوں کے لیے سخت تعزیری قوانین بیان کیے ہیں۔ اسلام کی ان تعلیمات پر عمل کیا جائے تو خاندان کا ادارہ مستحکم ہوگا اور صالح تمدن کے فروغ کے لیے اپنا کردار بہ خوبی انجام دے سکے گا۔

☆☆☆

جنسی بے راہ روی اور زناکاری

موجودہ دور کا ایک سماجی مسئلہ جس نے ملکی اور عالمی دونوں سطحوں پر سنگین صورت اختیار کر لی ہے، خواتین کی عزت و آبرو کی پامالی اور عصمت دری ہے۔ وہ اپنوں اور پرایوں دونوں کی جانب سے زیادتی اور دست درازی کا شکار ہیں۔ کوئی جگہ ان کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ گھر ہو یا دفتر، پارک ہو یا بازار، ٹرین ہو یا بس، ہر جگہ ان کی عصمت پر حملے ہو رہے ہیں اور انھیں بے آبرو کیا جا رہا ہے۔ کبھی معاملہ عصمت دری پر رک جاتا ہے تو کبھی ظلم کی شکار خاتون کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ ایک گھناونی صورت اجتماعی آبرو ریزی کی ہے، جس میں کئی نوجوان مل کر کسی معصوم لڑکی کو اپنی ہوس کا شکار بناتے ہیں، پھر بڑے دردناک طریقے سے اسے قتل کر دیتے ہیں۔

موجودہ صورت حال

عصمتِ نسواں کی پامالی آج کل پوری دنیا میں عام ہے۔ اس میں ترقی یافتہ ممالک، ترقی پذیر ممالک اور پس ماندہ ممالک، کسی کا استثنا نہیں ہے۔ امریکہ کے ڈپارٹمنٹ آف جسٹس کی ایک سروے رپورٹ National Crime Victimization Survey کے مطابق ۲۰۱۲ء میں تین لاکھ چھیالیس ہزار آٹھ سو تیس (۳،۸٦،۸۳۰) عورتوں کے ساتھ زنا کیا گیا۔

ہندوستان میں ۲۰۱۳ء میں زنا کے تینتیس ہزار سات سو سات (۳۳،۷۰۷) معاملات درج کیے گئے، جب کہ ۲۰۰۹ء میں ان کی تعداد اکیس ہزار تین سو ستانوے (۲۱،۳۹۷) تھی۔ متاثرہ لڑکیوں میں سے تقریباً تیرہ فی صد کی عمر چودہ سال سے کم تھی، جب کہ چودہ سے

اٹھارہ سال کی درمیانی عمر کی لڑکیوں کا تناسب چھبیس فی صد اور اٹھارہ سے تیس سال کی درمیانی عمر کی لڑکیوں کا تناسب چھیالیس فی صد تھا۔

ہندوستان میں زنا کاری اور عصمت دری کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ کسی دن کا اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے، عصمت دری کی بہت سی خبریں اس میں مل جائیں گی۔ ان میں سے کچھ ہی معاملے عدالتوں تک پہنچ پاتے ہیں۔ اور جو پہنچتے ہیں، ان میں بھی عدالتی پیچیدگیوں کی وجہ سے فیصلہ آنے میں کئی سال لگ جاتے ہیں اور بہت کم ہی کیسوں میں مجرموں کو سزا مل پاتی ہے۔

سخت تر سزا کا مطالبہ

ملک میں یہ واقعات اب اتنی کثرت سے پیش آنے لگے ہیں کہ ان کی سنگینی کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن انہی کے درمیان کبھی کوئی دردناک واقعہ رونما ہوتا ہے تو عوام بیدار ہو جاتے اور اس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتے ہیں۔ اس موقع پر ایسے جرائم کی روک تھام کے لیے مختلف تجاویز سامنے آتی ہیں۔ مثلاً مجرموں کو سرِ عام پھانسی دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، سخت سے سخت قوانین بنانے کی بات کہی جاتی ہے، کڑی نگرانی کے لیے سی سی ٹی وی کیمرے نصب کرنے اور مضبوط سیکوریٹی فراہم کرنے پر زور دیا جاتا ہے، لڑکیوں کو جوڈو کراٹا سیکھنے اور خود حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں بعض اطراف سے ایک آواز یہ بھی سنائی دیتی ہے کہ زنا کی وہ سزا نافذ کی جائے جو اسلام نے تجویز کی ہے۔ اسی بات کو بعض لوگ ان الفاظ میں کہتے ہیں کہ سزائے زنا کے لیے عرب ملکوں جیسا قانون بنایا جائے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ مطالبہ ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے، جو اسلام کے شدید مخالف ہیں، جو اسلام پر اعتراضات کرنے اور مسلمانوں کو برا بھلا کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، لیکن چوں کہ انھوں نے کہیں سے سن رکھا ہے کہ اسلام زنا کرنے والے کو پتھر مار مار کر ہلاک کرنے کا حکم دیتا ہے اور جرم کی سنگینی کی بنا پر یہ سزا ان کے دل کی آواز ہوتی ہے، اس لیے ان کے اندرون میں چھپی خواہش ان کی زبان پر آجاتی ہے اور وہ خواہی نہ خواہی اسلام کا نام لینے لگتے ہیں۔

جرائم کی روک تھام محض قانون سے ممکن نہیں

آبروریزی کے واقعات کی روک تھام کے لیے سخت سے سخت قانون بنانے کی بات کی جائے، یا اسلامی سزائے زنا کو نافذ کرنے کی تجویز رکھی جائے، دونوں مطالبے جذباتیت کے مظہر اور سنجیدگی سے محروم ہیں۔ کتنا ہی سخت قانون بنالیا جائے، اس سے جرائم کا بالکلیہ خاتمہ ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سماج کو پاکیزہ بنانے کی تدابیر اختیار کی جائیں اور جو چیزیں افراد کو غلط کاموں پر ابھارتی اور جرائم کے ارتکاب کی جانب مائل کرتی ہیں، ان پر پابندی عائد کی جائے۔ قانون جرائم کو روکنے میں معاون تو ہوسکتا ہے، لیکن محض قانون سے ان کا سدِّ باب ناممکن ہے۔ اگر جرائم کے تمام محرکات اور ترغیبات کو علی حالہ باقی رکھا جائے اور محض کوئی سخت تر قانون منظور کرلیا جائے تو جرائم میں تو کوئی کمی نہیں آئے گی، البتہ قانون کے غلط انطباقات کے اندیشے بڑھ جائیں گے۔ عدالتوں کے بھاری مصارف کی بنا پر اس کا خدشہ ہے کہ غریب افراد اپنے دفاع سے عاجز سزا پا جائیں اور مال دار اور طاقت ور اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے سزا سے بچ جائیں۔

پورے اسلامی نظام کا نفاذ ضروری ہے

اسی طرح اسلام کے کسی ایک حکم کا مطالبہ اور دیگر احکام سے صرفِ نظر درست رویہ نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے اسلامی نظام کو ایک کل کی حیثیت سے قبول کرنا ہوگا۔ اسلامی تعلیمات کے اثرات و برکات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پورے کے پورے اسلام کو نافذ کیا جائے۔ جس طرح کوئی مشین اسی وقت صحیح طریقے سے کام کرے گی، جب اس کے تمام پرزے اپنی اپنی جگہ فٹ ہوں، اگر اس میں سے کوئی ایک پرزہ نکال لیا جائے تو نہ مشین صحیح ڈھنگ سے وہ کام کرے گی جس کے لیے اسے بنایا گیا ہے اور نہ اس نکالے گئے پرزے سے وہ کام لیا جاسکتا ہے جو پوری مشین کے کرنے کا تھا، اسی طرح اسلام کے کسی ایک قانون کو نافذ کردیا جائے اور اس کے دیگر احکام پر عمل نہ کیا جائے تو اس سے بھی مطلوبہ فائدے حاصل نہیں ہوسکتے۔

جنس کے تعلق سے مختلف رویے

ہر انسان میں بنیادی طور پر تین طرح کی خواہشات پائی جاتی ہیں۔ کھانے کی خواہش، پینے کی خواہش اور جنس (Sex) کی خواہش۔ کوئی بھی انسان ہو، چاہے وہ دہریہ ہو یا سیکولر، یا اس کا کسی مذہب سے تعلق ہو، بہ حیثیت انسان اس کے اندر ان فطری خواہشات کا پایا جانا لازمی ہے۔ جنس کے تعلق سے مختلف رویے اختیار کیے گئے ہیں۔

کچھ لوگوں نے جنسی خواہش کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ تصور پیش کیا کہ جنسی خواہش کو دبا کر ہی انسان کی نجات ممکن ہے، تبھی اسے نروان حاصل ہو سکتا ہے اور وہ کامیابی کے مدارج طے کر سکتا ہے۔ یہ تصور عیسائیت میں راہبوں اور ہندو مت میں جوگیوں کے یہاں ملتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جنسی تعلق کو ایک قابل نفرت چیز سمجھا اور شادی بیاہ کے بکھیڑوں میں پڑنے سے گریز کیا۔ انھوں نے جنگلوں اور بیابانوں کی راہ لی اور وہاں کٹیا بنا کر تنہائی کی زندگی گزارنے لگے۔ اسی طرح ان مذاہب میں ان لوگوں کو عظمت کی نگاہ سے دیکھا گیا جو غیر شادی شدہ رہتے ہوئے پوری زندگی گزار دیں، چنانچہ انھیں چرچوں اور مندروں میں اعلیٰ مناصب سے نوازا گیا۔ لیکن انسانی فطرت کو دبا کر اور اس سے جنگ کر کے زندگی گزارنا ممکن نہیں ہے، چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ چرچ سے وابستہ پادری اور مندروں کے پجاری بار بار بدکاری میں ملوث پائے گئے ہیں اور روحانیت اور پوجا پاٹھ کے ان مراکز کی پاکیزگی پامال ہوئی ہے۔

اس کے بالمقابل کچھ لوگوں نے جنس کے معاملے میں ہر طرح کی آزادی کی وکالت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اس لیے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ جس طرح چاہے اپنی جنسی خواہش پوری کر لے، خواہ اس کے لیے وہ کتنا ہی غیر فطری طریقہ کیوں نہ اختیار کرے۔ چنانچہ ہم جنسی کو قانونی تحفظ فراہم کیا گیا اور مرد کو مرد کے ذریعے اور عورت کو عورت کے ذریعے جنسی تسکین حاصل کرنے کا حق دیا گیا۔ جن لوگوں نے یہ غیر فطری طریقہ نہیں اختیار کیا انھوں نے بھی نکاح کرنے اور خاندان تشکیل دینے کو فرسودہ قرار دیا اور بہتری اس میں سمجھی کہ کوئی مرد اور عورت جب تک چاہیں ساتھ رہیں اور جب چاہیں الگ ہو کر اپنی اپنی راہ لیں۔ کھلی

چھوٹ دے دی گئی کہ وہ باہم رضامندی سے جب چاہیں جنسی تعلق قائم کرلیں۔ صرف زور زبردستی کو قانوناً جرم قرار دیا گیا۔ یہ تصور پیش کیا گیا کہ ہر انسان اپنے جسم کا مالک ہے، وہ اپنے جس عضو کو چاہے چھپائے اور جس کو چاہے کھلا رکھے۔ اسی طرح اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اپنے اعضاء سے جیسا چاہے کام لے۔ چنانچہ عورتوں کے رحم (Uterus) کرایے پر ملنے لگے کہ کوئی بھی مرد اس میں اپنا نطفہ داخل کروا کے بچہ حاصل کرسکتا ہے۔ اسی طرح مردوں کے نطفے (Sperm) کی بھی تجارت ہونے لگی اور اس کے بینک قائم ہوگئے۔ ان چیزوں نے بہت بڑی انڈسٹری کی صورت اختیار کرلی جس میں کروڑوں اربوں روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس بے مہار آزادی نے انسانی سماج کو جانوروں کے باڑے میں تبدیل کردیا۔ اس کے نتیجے میں انارکی، انتشار، فتنہ وفساد اور قتل وغارت گری کو خوب فروغ ملا، زنا بالجبر کے واقعات کثرت سے پیش آنے لگے، جنسی بیماریاں: آتشک، سوزاک، امراض رحم، اسقاط وغیرہ عام ہوگئیں، یہاں تک کہ فطرت سے بغاوت کی سزا ایڈز کی صورت میں ملی، جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اربوں کھربوں ڈالر خرچ کرنے کے باوجود اب تک اس پر قابو نہیں پایا جاسکا ہے۔ عالمی سطح پر ہونے والی سروے رپورٹوں سے ظاہر ہے کہ ایڈز کے متاثرین میں اسی (۸۰) فی صد سے زائد افراد کو یہ مرض جنسی آوارگی کے نتیجے میں لاحق ہوا ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر

جنس کے بارے میں تیسرا نقطۂ نظر وہ ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر افراط اور تفریط کے درمیان ہے۔ اسلام نہ تو جنسی جذبہ کو دبانے اور کچلنے کی ترغیب دیتا ہے اور نہ انسان کو کھلی چھوٹ دے دیتا ہے کہ جس طرح اور جہاں چاہے اس کی تسکین کرلے۔ وہ ہر انسان کو اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کا حق دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی اسے کنٹرول کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔

صرف نکاح کے ذریعے جنسی خواہش پوری کی جائے

اسلام نے جنسی خواہش کی تکمیل کو نکاح کا پابند بنایا ہے اور اس سے ماورا کسی طرح کا

تعلق رکھنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اس نے مردوں اور عورتوں دونوں پر سخت پابندی عائد کی ہے کہ وہ نکاح کے علاوہ باہم کسی طرح کا جنسی تعلق نہ رکھیں۔ قرآن میں ہے:

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ (المائدۃ:۵)

"اس طرح کہ تم (مرد) ان (عورتوں) سے باقاعدہ نکاح کرو، یہ نہیں کہ علانیہ زنا کرو یا پوشیدہ بدکاری کرو۔"

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ (النساء:۲۵)

"وہ (عورتیں) پاک دامن ہوں، نہ کہ علانیہ بدکاری کرنے والیاں، نہ خفیہ آشنائی کرنے والیاں۔"

ان آیات میں مردوں اور عورتوں دونوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے نکاح کریں۔ اس طرح وہ شیطان کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ نکاح سے ماورا کسی طرح کا تعلق نہ علانیہ قائم کریں نہ چوری چھپے۔

اسلام نے زنا کو ایک سنگین سماجی جرم قرار دیا ہے اور اسے گھناؤنا اور برا فعل کہتے ہوئے اس سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝

(بنی اسرائیل:۳۲)

"اور زنا کے قریب نہ جاؤ۔ بلاشبہ وہ بڑی بے شرمی کا کام اور برا راستہ ہے۔"

اس نے کامیاب انسانوں کا ایک وصف یہ قرار دیا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ...

(المومنون:۵-۶)

"وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور بیویوں... کے سوا اور کہیں ان کا استعمال نہیں کرتے۔"

اسلام کی نظر میں جتنا سنگین جرم زنا بالجبر ہے، اتنا ہی سنگین جرم زنا بالرضا بھی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح ایک مرد کسی عورت پر جبر کر کے اس کی عصمت کو

داغ دار کرتا اور اس کی پرسکون زندگی میں زہر گھولتا ہے، اسی طرح دو مرد و عورت باہم رضا مندی سے جنسی تعلق قائم کر کے سماج کی پاکیزگی کو ختم کرتے اور اجتماعی امن وسکون پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، اس لیے دونوں برابر کے مجرم ہیں۔

نکاح کی ترغیب اور اسے آسان بنانا

اسلام چاہتا ہے کہ بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد کوئی بھی لڑکا یا لڑکی بغیر نکاح کے نہ رہیں، بلکہ جلد از جلد نکاح کے بندھن میں بندھ جائیں۔ چنانچہ وہ ان کے سرپرستوں کو اس کی طرف متوجہ کرتا اور ان کا نکاح کرا دینے کی تلقین کرتا ہے۔ زمانۂ نزول قرآن میں غلامی کا رواج تھا، مردوں اور عورتوں کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ قرآن نے حکم دیا کہ نہ صرف اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کی فکر کرو، بلکہ اپنے غلاموں اور لونڈیوں کا بھی نکاح کرا دو:

> وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ
>
> (النور: ۳۲)
>
> ”تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمھارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کردو۔“

اسلام نہیں چاہتا کہ کوئی نوجوان مرد بغیر بیوی کے اور کوئی نوجوان عورت بغیر شوہر کے رہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے متعدد ارشادات میں نکاح کی ترغیب دی ہے اور اس سے غفلت کے برے نتائج سے ڈرایا ہے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

> يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ، مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ(۱)
>
> ”اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو بھی شادی کی استطاعت رکھتا ہو اسے شادی کر لینی چاہیے، اس لیے کہ یہ نگاہ کو نیچی رکھنے اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے کا زیادہ کارگر طریقہ ہے۔“

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الصوم: ۱۹۰۵، کتاب النکاح ۵۰۶۵، صحیح مسلم کتاب النکاح: ۱۴۰۰

ایک موقع پر آپ نے سخت الفاظ میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

مَنْ قَدَرَ عَلٰی اَنْ يَّنْكِحَ فَلَمْ يَنْكِحْ فَلَيْسَ مِنَّا (۱)

''جو شخص نکاح کرنے پر قادر ہو، پھر بھی نکاح نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔''

آپ نے لڑکیوں کے سرپرستوں کو مخاطب کرکے انھیں نصیحت کی کہ اگر کوئی اچھا رشتہ آجائے تو نکاح کرنے میں بالکل تاخیر نہ کریں:

اِذَا خَطَبَ اِلَيْكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَهٗ وَ خُلُقَهٗ فَزَوِّجُوْهُ اِلَّا تَفْعَلُوْا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِيْضٌ (۲)

''جب تمھارے پاس کسی ایسے شخص کی طرف سے پیغام آئے جس کی دین داری اور اخلاق تمھارے نزدیک پسندیدہ ہوں تو اس سے نکاح کرادو۔ اگر ایسا نہیں کروگے تو روئے زمین پر فتنہ اور وسیع فساد برپا ہوجائے گا۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے نکاح کی صرف ترغیب ہی نہیں دی، بلکہ آپ نے اسے آسان بنانے کے صریح احکام دیے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

خَيْرُ النِّكَاحِ اَيْسَرُهٗ (۳)

''سب سے بہتر نکاح وہ ہے جو بہت سہولت سے انجام پا جائے۔''

اسلام میں نکاح کے انعقاد کا طریقہ بھی بہت آسان رکھا گیا ہے۔ دو گواہوں کی موجودگی میں لڑکا اور لڑکی میں سے کوئی نکاح کی پیش کش کرے اور دوسرا اسے قبول کرلے، بس نکاح ہوگیا۔ نکاح کے وقت دعوت لڑکی والوں کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ نکاح کی خوشی میں لڑکے کو ولیمہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

آج کل مختلف اسباب سے نکاح میں تاخیر کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک سبب بڑے پیمانے پر جہیز کا لین دین ہے۔ اسلام میں جہیز کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بعض حضرات کہتے

---

(۱) سنن دارمی، کتاب النکاح: ۲۲۱۹

(۲) جامع ترمذی، کتاب النکاح: ۱۰۸۴

(۳) سنن ابوداؤد، کتاب النکاح: ۲۱۱۷

ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو جہیز دیا تھا، لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ آپؐ نے جب حضرت فاطمہؓ کا نکاح اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ بن ابی طالب سے (جو بچپن ہی سے آپ کی سرپرستی میں آپؐ کے ساتھ رہتے تھے) کرنا چاہا تو ان سے دریافت کیا: تمھارے پاس کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ایک زرہ۔ آپؐ نے اسے فروخت کروا دیا اور اس کی رقم سے شادی کے بعد کام آنے والا کچھ سامان خریدنے کا حکم دیا۔ گویا اس موقع پر جو بھی سامان آیا اس کے مصارف خود حضرت علیؓ نے برداشت کیے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کے علاوہ آپؐ نے اپنی تین اور صاحب زادیوں کا نکاح کیا۔ کسی موقع پر بہ طور جہیز کچھ دینے کا تذکرہ روایات میں نہیں ملتا ہے۔

عہد نبوی میں نکاح کو آسان بنانے کے واقعات حدیث کی کتابوں میں اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

ایک دوشیزہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئی اور آپؐ سے اپنا نکاح کرا دینے کی خواہش کی۔ اس مجلس میں موجود ایک نوجوان آمادہ ہو گیا۔ آپؐ نے اس سے دریافت کیا: تمھارے پاس کچھ ہے؟ اس نے جواب دیا: کچھ بھی نہیں۔ آپؐ نے پھر سوال کیا: کیا تمھارے پاس لوہے کی ایک انگوٹھی بھی نہیں ہے؟ اس نے جواب دیا: وہ بھی نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تمھیں کچھ قرآن یاد ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں، فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں؟ آپؐ نے اسی پر دونوں کا نکاح کرا دیا۔(۱)

ایک نوجوان، جو قبیلۂ بنو بیاضہ کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھا، پچھنا لگانے کا کام کیا کرتا تھا۔ اس پیشے سے وابستہ لوگوں کو کم تر درجے کا سمجھا جاتا تھا۔ آپؐ نے قبیلے والوں کو حکم دیا کہ اس نوجوان کی شادی کی فکر کریں اور قبیلے کی کسی لڑکی سے اس کا رشتہ کر دیں۔(۲)

تعددِ ازدواج کی اجازت

اسلام نے مرد کو ایک سے زیادہ (چار تک) عورتوں کو بہ یک وقت اپنے نکاح میں

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب النکاح: ۵۱۲۱، صحیح مسلم، کتاب النکاح: ۱۴۲۵

(۲) سنن ابوداؤد، کتاب النکاح: ۲۱۰۲

رکھنے کی اجازت دی ہے۔ قرآن میں ہے:

وَإِنۡ خِفۡتُمۡ أَلَّا تُقۡسِطُواْ فِى ٱلۡيَتَٰمَىٰ فَٱنكِحُواْ مَا طَابَ لَكُم مِّنَ ٱلنِّسَآءِ مَثۡنَىٰ وَثُلَٰثَ وَرُبَٰعَۖ فَإِنۡ خِفۡتُمۡ أَلَّا تَعۡدِلُواْ فَوَٰحِدَةً

(النساء: ۳)

”اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔“

اسلام کی اس تعلیم کو بھی اعتراضات کا نشانہ بنایا جاتا ہے، حالاں کہ غور کرنا چاہیے کہ اسلام نے اس کا حکم نہیں دیا ہے کہ لازماً ہر مرد ایک سے زائد شادیاں کرے، بلکہ اس کی صرف اجازت دی ہے۔ جب یہ حکم نازل ہوا تھا، تب ہنگامی حالات تھے، جنگیں ہو رہی تھیں، مرد مارے جا رہے تھے اور شادی شدہ عورتیں بیوہ ہو رہی تھیں، اس وقت ان کے نکاح کی یہ صورت نکالی گئی۔ بعد میں بھی اس حکم کو عام رکھا گیا، اس لیے کہ کسی شخص کے حالات ایسے ہو سکتے ہیں کہ اسے ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔ مثلاً پہلی بیوی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے کہ وہ جنسی تعلق کے قابل ہی نہ رہے۔ پھر کیا مرد دوسری عورت سے نکاح کرنے کے لیے اسے طلاق دے دے؟!

بعض سماجوں میں مرد کو صرف ایک عورت سے نکاح کرنے کا پابند کیا گیا ہے، لیکن اسے کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے کہ ناجائز طریقے سے جتنی عورتوں سے چاہے جنسی تعلق رکھے۔ اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اگر ضرورت ہو تو آدمی ایک سے زائد چار عورتوں تک سے نکاح کر سکتا ہے، لیکن اس صورت میں اس پر لازم ہوگا کہ وہ ان سب کو تمام قانونی حقوق دے اور ان کے ساتھ برابری کا معاملہ کرے۔

دوسرا نکاح معیوب نہیں

اسلام اس چیز کو بھی پسند نہیں کرتا کہ اگر کسی مرد کی بیوی یا کسی عورت کے شوہر کا انتقال

ہوجائے یا کسی شادی شدہ جوڑے کے درمیان علیحدگی ہوجائے تو ان میں سے ہر ایک اپنی بقیہ زندگی تجرد کی حالت میں گزار دے، کیوں کہ اسلام نہیں چاہتا کہ سماج میں کوئی مرد بغیر بیوی کے اور کوئی عورت بغیر شوہر کے رہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس کی بڑی روشن مثالیں ملتی ہیں۔

حضرت عاتکہؓ بنت زید مشہور صحابیہ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے صاحب زادے عبداللہؓ سے ان کا نکاح ہوا۔ وہ شہید ہوگئے تو حضرت زید بن خطابؓ نے ان سے نکاح کرلیا۔ ان کی شہادت کے بعد وہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی زوجیت میں آگئیں۔ وہ بھی شہید ہوگئے تو حضرت زبیر بن العوامؓ سے ان کا نکاح ہوگیا۔ آخر میں وہ حضرت حسن بن علیؓ کی زوجیت میں آگئیں۔ اسی بنا پر ان کا نام ہی زوجۃ الشہداء (شہید ہونے والوں کی بیوی) پڑ گیا تھا۔(۱)

حضرت اسماء بنت عمیسؓ کی شادی حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے ہوئی، ان کی شہادت کے بعد وہ حضرت ابوبکرؓ کی زوجیت میں آگئیں، پھر جب ان کا انتقال ہوگیا تو حضرت علیؓ نے ان سے نکاح کرلیا۔(۲)

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی۔ عدت پوری ہوتے ہی ان کے پاس نکاح کے پیغامات آنے لگے۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے مشورہ کیا۔ آپؐ نے ایک اچھے رشتے کی نشان دہی فرمادی۔(۳)

اسلامی عقائد۔ تربیت کا اہم ذریعہ

ایک چیز یہ بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد انسان کی بھرپور تربیت کرتے ہیں اور اسے زندگی کے کسی معاملے میں بھٹکنے سے بچاتے ہیں۔ ان عقائد پر ایمان سے آدمی کی زندگی سنورتی ہے اور اس میں پاکیزگی آتی ہے۔ خاص طور پر دو عقائد کا کردار اس معاملے میں بہت نمایاں ہے:

---

(۱) ابن الاثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۱۹۹۔۲۰۰

(۲) اسد الغابۃ: ۷/ ۱۴

(۳) صحیح مسلم، کتاب الطلاق: ۱۴۸۰

(الف) اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے

اسلام یہ تصور دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور ہر انسان کو دیکھ رہا ہے۔ وہ کوئی کام چاہے علانیہ کرے یا چھپ کر کسی کھلی جگہ کرے یا بند کمرے میں یا کسی تہ خانے میں، کوئی بات زور سے کہے یا کسی کے ساتھ سرگوشی کرے۔ کسی غلط کام کا ارتکاب روئے زمین پر کرے یا سمندر کی تہوں میں جا کر۔ کوئی لفظ زبان پر لائے یا کوئی خیال اس کے دل میں آئے یا محض آنکھوں سے اشارہ بازی کرے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کی خبر ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ کائنات کے ذرے ذرے پر نظر رکھتا ہے، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ اس مضمون کی چند آیات درج ذیل ہیں:

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۖ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید:۴)

"اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے۔ وہ تمھارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔"

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا
(الانعام:۵۹)

"خشکی اور سمندر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے، درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔"

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْأَرْضِ ۖ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ ○ (الانعام:۳)

"وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی، تمھارے کھلے اور چھپے سب حال جانتا ہے اور جو برائی یا بھلائی تم کماتے ہو اس سے خوب واقف ہے۔"

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۖ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ

مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا (المجادلہ: ۷)

”کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا اللہ کو علم ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو، یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے اندر چھٹا اللہ نہ ہو۔ خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ، جہاں کہیں بھی وہ ہوں، اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔“

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝ (المؤمن: ۱۹)

”اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔“

جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ موجود ہونے اور ہر چیز سے باخبر رہنے کا عقیدہ راسخ ہوگا وہ اس جگہ بھی، جہاں کوئی آنکھ اسے دیکھ نہ رہی ہو، کسی برائی کے ارتکاب سے بچے گا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی عورت تنہائی کا فائدہ اٹھا کر اسے معصیت کی دعوت دے گی تو بھی وہ اس کی دعوت کو ٹھکرا دے گا اور فوراً پکار اٹھے گا کہ مجھے اللہ کا خوف ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن سات طرح کے افراد عرشِ الٰہی کے سایے میں ہوں گے۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہوگا جس کو کوئی خوب صورت اور جاہ و منصب والی عورت بدکاری کے لیے بلائے، لیکن وہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔⑴

(ب) آخرت میں دنیا کے ہر عمل کا حساب ہوگا

دوسرا اسلامی عقیدہ، جو انسان کو دنیا میں محتاط زندگی گزارنے پر آمادہ کرتا ہے، آخرت کا عقیدہ ہے۔ اس کے مطابق یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ دنیا فنا ہو جائے گی اور دوسری دنیا برپا ہوگی۔ اس میں تمام انسان دوبارہ پیدا کیے جائیں گے اور ان سے اس دنیا میں کیے گئے ان کے تمام اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ جن لوگوں نے یہاں اچھا کام کیے ہوں گے انھیں جنت عطا کی جائے گی، جس میں طرح طرح کی نعمتیں ہوں گی اور جن لوگوں نے یہاں

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ: ۱۴۲۳، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ: ۱۰۳۱

برے کام کیے ہوں گے انھیں جہنم میں جھونک دیا جائے گا، جس میں تکلیف واذیت کا ہر سامان موجود ہوگا۔ اس دنیا میں کیا گیا کوئی عمل خواہ اچھا ہو یا برا، وہاں نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکے گا۔ قرآن میں ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال: ۷-۸)

”پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔“

یہاں اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، جو ان کی تمام حرکات و سکنات کو نوٹ کر رہے ہیں۔ روز قیامت ہر انسان کا پورا نامۂ اعمال اس کے سامنے ہوگا اور وہ دنیا میں کیے گئے کسی عمل کا انکار نہ کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الانفطار: ۹-۱۲)

”بلکہ تم لوگ جزا وسزا کو جھٹلاتے ہو، حالاں کہ تم پر نگراں مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب جو تمھارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔“

جذبہ حیا کا فروغ

اسلام نے ہر فرد کے اندر حیا کا جذبہ ابھارا ہے۔ یہ جذبہ اسے بے حیائی کے کاموں سے روکتا ہے۔ اگر کسی کے اندر حیا نہ ہو تو وہ غلط سے غلط کام کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ مِمَّا اَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰى: اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ (۱)

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب: ۶۱۲۰

> "سابقہ زمانوں کی ایک پیغمبرانہ بات یہ ہے کہ اگر تم میں حیا نہ ہو تو جو جی میں آئے کر بیٹھو گے (سخت گھناؤنے کام سے بھی نہیں ہچکچاؤ گے)۔"

حیا کے جذبے ہی سے انسان اپنے اعضائے ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے سے باز رہتا ہے۔ ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا: اپنے اعضائے ستر اپنی بیوی کے علاوہ اور کسی کے سامنے نہ کھولو۔ انھوں نے سوال کیا: اے اللہ کے نبی ﷺ! اگر کوئی شخص کسی جگہ تنہا ہو اور وہاں دوسرا کوئی نہ ہو تو کیا تب بھی وہ اپنے اعضاء ستر کو چھپائے رہے؟ آپ نے جواب دیا: انسانوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔" (۱)

معاشرہ کی پاکیزگی کے لیے احتیاطی تدابیر

اسلام نے افراد کے لیے جنسی آسودگی فراہم کرنے کے ساتھ معاشرہ کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے مختلف احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں۔ یہ تدابیر افراد کو جرائم کا ارتکاب کرنے سے باز رکھتی ہیں اور جنسی جرائم کے تمام ممکنہ چور دروازوں کو بند کرتی ہیں۔ یہ تدابیر درج ذیل ہیں:

۱۔ نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم

اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بدنگاہی سے بچیں اور آبرو کی حفاظت کریں۔ قرآن میں ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ

(النور: ۳۰)

"اے نبی! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔"

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ

(النور: ۳۱)

---

(۱) سنن ابوداؤد، کتاب الحمام: ۴۰۱۷

"اور اے نبی، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔"

ان آیات میں دو باتیں (نظریں بچانا اور شرم گاہ کی حفاظت کرنا) ساتھ ساتھ کہی گئی ہیں۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ دونوں کا خاص تعلق ہے۔ اگر کوئی شخص، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنی نگاہوں کو قابو میں نہیں رکھے گا تو اس کے بدکاری کی کھائی میں جا گرنے کا اندیشہ رہے گا۔

ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت علیؓ کو، جو آپ کے داماد بھی تھے، نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

يَا عَلِيُّ لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَإِنَّ لَكَ الْأُولَى وَلَيْسَتْ لَكَ الْآخِرَةُ(۱)

"اے علی، اگر کسی اجنبی عورت پر تمھاری نظر پڑ جائے تو فوراً اپنی نظر پھیر لو اور دوبارہ اسے نہ دیکھو، اس لیے کہ پہلی نظر تو قابل مواخذہ نہیں، لیکن دوبارہ اسے دیکھنے کا تمھیں حق نہیں ہے۔"

۲۔ نامحرم کے ساتھ تنہائی میں رہنے کی ممانعت

اسلام کی ایک تعلیم یہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت کسی نامحرم کے ساتھ تنہائی میں نہ رہے۔ اس کی بہت سخت الفاظ میں ممانعت آئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أَلَا لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا كَانَ ثَالِثَهُمَا الشَّيْطَانُ(۲)

"کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں ہرگز نہ رہے، کیوں کہ اس صورت میں ان کے ساتھ تیسرا لازماً شیطان ہوگا۔"

ایک مرتبہ آپؐ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: "جب عورتیں تنہا ہوں تو ان کے پاس

---

(۱) سنن ابوداؤد، کتاب النکاح: ۲۱۴۹، جامع ترمذی: ۲۷۷۷

(۲) جامع ترمذی، کتاب الفتن: ۲۱۶۵

ہرگز نہ جاؤ۔" اس پر ایک شخص نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول، کیا عورت کا سسرالی رشتہ دار (دیور یا جیٹھ وغیرہ) بھی نہیں جا سکتا؟ فرمایا: وہ تو موت ہے۔" (۱)

۳۔ آزادانہ اختلاط پسندیدہ نہیں

اسلام مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط پسند نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ مرد اور عورتیں گھل مل کر نہ رہیں، اس لیے کہ مخلوط طور پر رہنے سے ان میں صنفی جذبات ابھرنے کا امکان رہتا ہے اور یہ چیز بسا اوقات بدکاری تک پہنچا سکتی ہے۔

ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے دیکھا کہ کچھ عورتیں سڑک کے درمیان مردوں کے ساتھ گھل مل کر چل رہی ہیں۔ آپ نے انھیں ٹوکا اور فرمایا:

إِسْتَأْخِرْنَ فَإِنَّهُ لَيْسَ لَكُنَّ أَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِيقَ عَلَيْكُنَّ بِحَافَّاتِ الطَّرِيقِ (۲)

"پیچھے ہٹ جاؤ، تمھارا راستے کے درمیان میں چلنا مناسب نہیں۔ کنارے ہو کر چلا کرو۔"

ام المومنین حضرت عائشہؓ نے خود رسول اللہ ﷺ کے بارے میں گواہی دی ہے کہ آپ نے کبھی کسی اجنبی عورت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ (۳)

۴۔ بغیر محرم عورت کے سفر پر پابندی

اسلام کی ایک ہدایت یہ ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر یا محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔ عورتیں جہاں رہتی ہیں وہاں تو وہ اپنی ضروریات کے لیے تنہا نکل سکتی ہیں، لیکن دور کی مسافت پر تنہا جانا ان کے لیے روا نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُسَافِرَ مَسِيرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ لَيْسَ مَعَهَا حُرْمَةٌ (۴)

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب النکاح: ۵۲۳۲، صحیح مسلم، کتاب السلام: ۲۱۷۲

(۲) سنن ابوداؤد، کتاب الادب: ۵۲۷۲

(۳) صحیح بخاری، کتاب الطلاق: ۵۲۸۸، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ: ۱۸۶۶

(۴) صحیح بخاری، ابواب تقصیر الصلاۃ: ۱۰۸۸، صحیح مسلم، کتاب الحج: ۳۳۹

> ”کوئی عورت، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہے، اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ بغیر محرم کے ایک دن اور ایک رات کی مسافت کا سفر کرے۔“

اسلام کی اس تعلیم پر اعتراض کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نے عورت کی آزادی کو محدود کر دیا ہے اور اسے گھر کی چار دیواری میں مقید کر دیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اسلام نے عورت کو گھر سے باہر نکلنے سے نہیں روکا ہے، لیکن وہ اس کی عزت و عصمت کو بہت اہمیت دیتا ہے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ جب عورت دور کی مسافت کے لیے نکلے تو اس کے ساتھ اس کا کوئی محرم ہو، تا کہ کوئی آوارہ اور بد چلن شخص اس کے ساتھ چھیڑ خانی کی ہمت نہ کر سکے۔

۵۔ عورت کے بن سنور کر اور خوشبو لگا کر نکلنے کی ممانعت

اسلام نے حکم دیا ہے کہ کوئی عورت سج دھج کر گھر سے باہر نہ نکلے اور نہ باہر نکلتے وقت خوشبو لگائے۔ اس لیے کہ اگر وہ ایسا کرے گی تو اجنبی مردوں کی نگاہیں اس کی جانب اٹھیں گی اور ان کے صنفی جذبات مشتعل ہوں گے، اس وجہ سے اس پر دست درازی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ بلکہ اس نے تاکید کی ہے کہ جب عورتیں گھر سے باہر نکلیں تو اپنے عام لباس کے اوپر ایک اور بڑا کپڑا (چادر وغیرہ) اوڑھ لیں، جس سے ان کا بدن خوب اچھی طرح ڈھک جائے اور ان کا کوئی عضو عریاں نظر نہ آئے۔

قرآن میں ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۚ (الاحزاب:۵۹)

”اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔“

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْمَرْاَةُ اِذَا اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ بِالْمَجْلِسِ فَهِيَ كَذَا وَكَذَا يَعْنِي زَانِيَةً (۱)

---

(۱) جامع ترمذی، کتاب الادب:۲۷۸۶

"عورت جب خوشبو لگا کر کسی ایسی جگہ سے گزرتی ہے جہاں بہت سے مرد ہوں تو وہ ایسی اور ایسی ہے (یعنی وہ بدکار ہے)۔"

۶۔ لباس ساتر ہو

اسلام کا ایک حکم یہ ہے کہ عورتیں ایسا لباس پہنیں جو ان کے پورے جسم کو (سوائے چہرہ اور ہاتھ کے) چھپانے والا ہو۔ نہ ان کا سر کھلا ہو، نہ گریبان چاک ہو اور نہ لباس اتنا شفاف ہو کہ ان کا بدن جھلکتا ہو۔ قرآن میں ہے:

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ (النور: ۳۱)

"عورتیں اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔"

ایک مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ آپ کے گھر آئیں۔ اس وقت وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ ان پر آپ کی نظر پڑی تو آپ نے اپنا چہرہ پھیر لیا اور فرمایا:

يَا أَسْمَاءُ إِنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا بَلَغَتِ الْمَحِيضَ لَمْ تَصْلُحْ أَنْ يُرَى مِنْهَا إِلَّا هٰذَا وَهٰذَا وَأَشَارَ إِلَى وَجْهِهِ وَكَفَّيْهِ (۱)

"اے اسماء! لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اس کے چہرے اور ہاتھ کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں رہنا چاہیے۔"

ایک مرتبہ آپ نے بہت سخت الفاظ میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُءُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيحَهَا وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ كَذَا وَكَذَا (۲)

"بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو لباس پہنے ہونے کے باوجود عریاں ہوتی ہیں۔ دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی اور دوسروں کی طرف خود مائل ہونے والی ہوتی

---

(۱) سنن ابوداود، کتاب اللباس: ۴۱۰۴

(۲) صحیح مسلم، کتاب اللباس: ۲۱۲۸

ہیں، ان کے سر بختی اونٹوں کے کوہان کی طرف اٹھے ہوتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پائیں گی حالاں کہ اس کی خوشبو کافی فاصلے سے محسوس ہوگی۔"

ایک حدیث میں ہے کہ "آپ نے ایسے مردوں پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور ایسی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔"(۱)

۷۔ پردہ کا خصوصی حکم

عورتوں کو ایک خصوصی حکم یہ بھی دیا گیا ہے کہ وہ غیر مردوں کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (النور: ۳۱)

"اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں، بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے۔"

اس آیت میں صرف اس زینت کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے، جو خود بہ خود ظاہر ہو جائے، اور جس کے چھپانے پر عورت کا اختیار نہ ہو۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ (گٹے تک) ہیں کہ انھیں عورت کھلا رکھ سکتی ہے، باقی پورے بدن کو چھپانا ضروری ہے۔ یہ علماء بھی کہتے ہیں کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو عورت کا اپنے چہرے کو چھپانا بہتر ہے۔

بدکاری کے محرکات پر پابندی

درج بالا احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے ساتھ اسلام نے ان چیزوں پر بھی پابندی عائد کی ہے جو بدکاری پر ابھارنے والی اور مردوں اور عورتوں میں جنسی جذبات برانگیختہ کرنے والی ہیں۔

(الف) شراب حرام ہے

بدکاری کی تحریک پیدا کرنے والی ایک اہم چیز شراب ہے۔ شراب کے بارے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ وہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ شراب پینے کے بعد آدمی اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتا اور بھلے برے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں رہتا کہ کب کیا حرکت کر بیٹھے۔

---

(۱) سنن ابوداؤد، کتاب اللباس: ۴۰۹۷، ۴۰۹۸، جامع ترمذی، کتاب الادب: ۲۷۸۴، ۲۷۸۵

اسی طرح شراب سے آدمی کے صنفی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں اور رشتوں کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ انہی وجوہ سے اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ قرآن نے شراب نوشی کو گندے شیطانی کاموں میں شمار کرتے ہوئے اہل ایمان کو اس سے بچنے کی تلقین کی ہے:

> يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ
> رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○
>
> (المائدۃ:۹۰)
>
> ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔“

شراب نوشی اسلام میں موجب سزا عمل ہے۔ ابتدائے اسلام میں اگرچہ اس کی کوئی متعین سزا نہیں تھی، لیکن بعد میں صحابہ کرام نے متفقہ طور پر اسی (۸۰) کوڑے سزا تجویز کی۔ اس کی دلیل انھوں نے یہی بیان کی کہ شراب پینے کے بعد آدمی کو اپنے ذہن و دماغ اور زبان پر قابو نہیں رہتا، وہ اول فول بکتا ہے اور عفت مآب خواتین پر گندے الزامات اور تہمتیں لگاتا ہے۔

ظاہر ہے، جب اسلام کے نزدیک شراب نوشی حرام ہے تو وہ شراب کی فیکٹریاں قائم کرنے اور اس کا کاروبار چلانے کی کیوں کر اجازت دے سکتا ہے!!

(ب) فحاشی کی اشاعت کی اجازت نہیں

اسی طرح اسلام سماج میں فحاشی کی اشاعت کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ وہ ان تمام چیزوں پر پابندی عائد کرتا ہے جن کے ذریعے بے حیائی اور عریانی عام ہو، گندی باتوں اور گندے کاموں کا پرچار ہو، جنھیں دیکھ کر اور سن کر عوام کے صنفی جذبات بھڑکیں اور برائی اور بدکاری کی جانب ان کا میلان ہو۔ جو لوگ سماج میں فحاشی پھیلانے کا ذریعہ بنتے ہیں، اسلام انھیں دردناک سزا کی وعید سناتا ہے۔ قرآن میں ہے:

> إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ
> عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط (النور:۱۹)

> "جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔"

موجودہ دور میں سماج میں فحاشی، بے حیائی اور عریانی پھیلانے والی بہت سی چیزیں رواج پا گئی ہیں، مثلاً گندی فلمیں، عریاں پوسٹر اور اشتہارات، بے حیائی کا پرچار کرنے والے رسائل، انٹرنیٹ پر بے شمار عریاں سائٹس وغیرہ۔ سماج کے لیے ان چیزوں کا ضرر رساں ہونا کھلی حقیقت ہے، لیکن چوں کہ انھوں نے انڈسٹریز کی شکل اختیار کرلی ہے اور ان سے حکومت اور سربرآوردہ طبقہ کو خطیر رقمیں حاصل ہوتی ہیں اس لیے ان کی خطرناکی کو نظرانداز کرکے انھیں خوب بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تمام چیزیں سماج کے لیے سم قاتل ہیں، اس لیے ان میں سے کسی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

زنا کی سزا

ان تمام تعلیمات اور ہدایات کے بعد، جو فرد اور سماج کی تربیت سے متعلق ہیں، آخر میں اسلامی قانون اپنا کام کرتا ہے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود سماج میں کچھ ایسے بدخصلت افراد ہوسکتے ہیں جو بدکاری میں ملوث ہوجائیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اسلام دردناک سزا تجویز کرتا ہے۔ وہ قانون یہ ہے:

> اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (النور: ۲)
>
> "زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔"

اس آیت سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ زنا کا ارتکاب اگر مرد اور عورت دونوں کی مرضی سے ہوا ہے تو دونوں سزا کے مستحق

ہیں۔ لیکن زنا بالجبر کی صورت میں صرف جبر کرنے والے کو سزا دی جائے گی۔

۲۔ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا ہے۔

۳۔ یہ اللہ کا دین ہے۔ جس طرح دین کے دیگر احکام واجب التعمیل ہیں، اسی طرح اس حکم پر بھی عمل ضروری ہے۔ اسے سماجی مسئلہ قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ زنا کے مجرمین کے ساتھ ترس کھانے کا جذبہ اہلِ ایمان کے دلوں میں نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ ان لوگوں نے بہت بھیانک جرم کیا ہے، اس لیے ان پر مذکورہ سزا لازماً نافذ کی جائے۔

۵۔ زنا کی سزا کسی پبلک مقام پر دی جائے، تاکہ دوسرے لوگ سزا نافذ ہوتے ہوئے دیکھ سکیں۔ اس سے وہ عبرت حاصل کریں گے اور اس غلط کام کے ارتکاب سے بچیں گے۔

اس آیت میں زنا کی سزا سو کوڑے بیان کی گئی ہے۔ یہ سزا غیر شادی شدہ افراد کے لیے ہے۔ احادیث اور عہد نبوی میں نافذ کی جانے والی سزاؤں کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کا ارتکاب کرنے والے شادی شدہ افراد کی سزا یہ ہے کہ انھیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔

غیر شادی شدہ اور شادی شدہ افراد کی سزاؤں میں فرق کی حکمت علماء نے یہ بیان کی ہے کہ شادی شدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو جنسی آسودگی حاصل ہو چکی ہے، اس کے باوجود اس نے اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کیا ہے، اس لیے وہ سخت ترین سزا کا مستحق ہے۔

سزا کے نفاذ کے لیے قطعی ثبوت ضروری ہے

اسلام نے زنا کی سزا جتنی سخت رکھی ہے، اس کے ثبوت کے لیے اتنی ہی کڑی شرائط بھی عائد کی ہیں۔ یا تو کوئی شخص اپنے ضمیر کی آواز پر اعتراف کر لے کہ اس سے یہ غلط کام سرزد ہو گیا ہے، تب اس پر یہ سزا نافذ کی جائے گی، یا چار مرد یہ گواہی دیں کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے کسی مرد اور عورت کو بدکاری کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان چاروں سے جرح کی جائے گی۔ اگر ان میں سے کسی ایک کی گواہی کمزور پڑی، اس نے کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے، بلکہ صرف میرا گمان اور قیاس ہے، تو ان چاروں کو حدِ قذف (تہمت کی سزا) کے طور پر

اسی اسی کوڑے لگائے جائیں گے۔ اسلام چاہتا ہے کہ قطعی ثبوت فراہم ہونے کے بعد ہی کسی کو یہ سزا دی جائے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ اسلام نے ہر شخص کے ضمیر کو بیدار کیا ہے اور اس کے اندر گناہ سے بچنے اور اگر اس کا ارتکاب ہو جائے تو اس سے پاکی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عہدِ نبوی میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا، جس میں چار مردوں نے یہ گواہی دی ہو کہ انھوں نے کسی مرد اور عورت کو بدکاری کرتے ہوئے دیکھا ہے اور اس گواہی کے نتیجے میں ان پر سزا کا نفاذ ہوا ہو۔ سزائے زنا کے جو اکا دکا واقعات اس دور میں پیش آئے ان سب میں زنا کرنے والوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر خود آ کر اعتراف کیا تھا۔

تطہیرِ معاشرہ کا آزمودہ نسخہ

معاشرہ کو پاکیزہ رکھنے کے لیے اسلام کی یہ تعلیمات محض نظری نہیں ہیں، بلکہ ان پر عمل ہو چکا ہے اور دنیا نے ان کے اثرات کا اپنی کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ عرب کا معاشرہ فسق و فجور کے دلدل میں غرق تھا، برائی کو برائی نہیں سمجھا جاتا تھا، عصمت و عفت کے کوئی معنی نہیں تھے، شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اسلام کی ان تعلیمات کے نتیجے میں ان کی زندگیاں پاکیزہ ہو گئیں، اخلاقی قدروں کو ان کے درمیان فروغ ملا اور عورت کو عزت و توقیر حاصل ہوئی۔ بعد کے ادوار میں جہاں جہاں ان تعلیمات پر عمل کیا گیا اور ان احکام کو نافذ کیا گیا وہاں سماج پر ان کے خوش گوار اثرات مرتب ہوئے۔ آج بھی جو لوگ سماج میں برائیوں کو پنپتا دیکھ کر فکر مند ہیں اور آبرو ریزی کے بڑھتے ہوئے واقعات کو روکنے کے لیے اسلامی سزا کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور اسے نافذ کیے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، اگر وہ سنجیدہ ہیں تو انھیں پورے اسلامی نظامِ معاشرت کو قبول کرنا اور اسلام کی تمام تعلیمات پر عمل کرنا ہوگا، تبھی مطلوبہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، برائیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے اور معاشرہ کی پاکیزگی قائم رکھی جا سکتی ہے۔

رحمِ مادر کا اجرت پر حصول

موجودہ دور میں سماجی سطح پر جو نئے مسائل ابھرے ہیں ان میں سے ایک اہم مسئلہ وہ ہے جسے 'رحمِ مادر کا اجرت پر حصول' (Womb on Rent) یا قائم مقام مادریت (Surrogacy) کا نام دیا گیا ہے۔

مغرب میں فحاشی، اباحیت، زنا بالرضا اور کثرتِ اسقاط کے نتیجے میں عورتیں تیزی سے پیداواری صلاحیت (Reproductive Ability) سے محروم ہو رہی ہیں۔ اس کا اندازہ Centre for Disease Control and Prevention کی ایک رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ۲۰۱۰ء میں 7.3 Million عورتیں، جن کی عمریں ۱۵ سے ۴۴ سال کے درمیان تھیں، بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک میں بعض معاشرتی برائیوں کو قانونی جواز فراہم کر دیا گیا ہے، مثلاً ہم جنسیت (Homosexuality) جس میں دو مرد یا دو عورتیں باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے لوگ جو قدرتی یا اکتسابی طور پر اولاد سے محروم ہوں اور وہ اولاد چاہتے ہوں، ان کے لیے یہ طریقہ نکالا گیا کہ وہ پیداواری صلاحیت کی حامل کسی عورت کی خدمات حاصل کریں، مصنوعی طور پر اس کی بار آوری (Fertilization) عمل میں آئے، وہ حمل اور وضع حمل کے مراحل سے گزرے، پھر جو بچہ اس کی کوکھ سے نکلے، اسے وہ ان کے حوالے کر دے۔

تاریخ اور موجودہ صورتِ حال

زمانہ قدیم میں وہ جوڑے، جو شوہر یا بیوی کے اعضائے تولید میں کسی نقص کی بنا پر اولاد سے محروم رہتے تھے، خاندان یا اس سے باہر کے کسی بچے کو لے کر اسے اپنا بیٹا بنا لیتے تھے۔ لیکن ماضی قریب میں میڈیکل سائنس کی غیر معمولی ترقی کے نتیجے میں ایسے افراد میں بھی صاحبِ اولاد ہونے کی امید جاگی اور اس کے لیے نت نئے طریقے اختیار کیے گئے۔ ان میں سے ایک 'اجرت پر رحم مادر کا حاصل کرنا' ہے۔

گزشتہ صدی کے ربع اخیر میں اس میدان میں انقلابی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ۱۹۷۱ء میں نیو یارک میں تجارتی بنیادوں پر مادۂ منویہ کی ذخیرہ اندوزی کا پہلا مرکز (Sperm Bank) قائم ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں انگلینڈ میں، بیرون رحم ٹیسٹ ٹیوب میں مخلوط نطفہ کی بار آوری (In Vitro Fertilization) کا کامیاب تجربہ کیا گیا، اس کے نتیجے میں پہلی ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا ہوئی۔ ۱۹۸۵ء میں امریکا میں قائم مقام مادریت کا پہلا کامیاب تجربہ کیا گیا۔ ایک عورت نے اپنا بیضہ اور رحم دونوں اس کام کے لیے پیش کیے۔ ایک مرد کے نطفے سے اس کے بیضے کو مخلوط کر کے اسی کے رحم میں استقرار حمل کا کام انجام پایا۔ اگلے سال اس سے ایک بچی پیدا ہوئی، جسے Baby M کا نام دیا گیا۔ پھر تو پوری دنیا میں اس تکنیک کو اختیار کیا جانے لگا۔ ابتدا میں اولاد چاہنے والے جوڑوں اور جنین کی پرورش کے لیے اپنا رحم پیش کرنے والی عورتوں کے درمیان کچھ تنازعات سامنے آئے، کہ وہ عورتیں وضع حمل کے بعد مادرانہ جذبات سے مغلوب ہو کر بچے حوالے کرنے سے انکار کر دیتی تھیں، لیکن بہت جلد عدالتی چارہ جوئی اور قوانین کی تشکیل کے ذریعے ان مسائل پر قابو پا لیا گیا۔

رحم مادر کی کرایہ داری کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت ہمدردانہ (Altruistic) یا رضاکارانہ (Voluntary) ہے، جس میں عورت اپنی خدمت کے عوض کوئی رقم نہیں لیتی اور دوسری تجارتی (Commercial) ہے، جس میں وہ بھاری معاوضہ وصول کرتی ہے۔ بعض ممالک میں اس تکنیک سے صرف رضاکارانہ طور پر فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے، اس خدمت کا

کوئی معاوضہ وصول کرنا ممنوع ہے، جب کہ بیشتر ممالک میں قانونی طور پر دونوں صورتوں کی اجازت ہے۔ مغرب میں اس چیز نے ایک منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کرلی ہے۔ جو عورتیں اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتی ہیں وہ اس پر خطیر رقم طلب کرتی ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا میں اس تکنیک سے بچہ حاصل کرنے پر اسی (۸۰) ہزار سے ایک لاکھ امریکی ڈالر کا صرفہ آتا ہے۔

ہندوستان میں اجرت پر رحم مادر کا حصول

عالمی سطح پر رحم مادر کی کرایہ داری کے معاملے میں ہندوستان سرِ فہرست ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ اس تکنیک کو اختیار کرنے پر ترقی یافتہ ممالک میں جو صرفہ آتا ہے، ہندوستان میں اس کی ایک تہائی رقم سے کام چل جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ یہاں غربت کے مارے افراد کو اس خدمت کے لیے خود کو پیش کرنے پر خاطر خواہ رقم مل جاتی ہے، جسے وہ اپنے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں ۲۰۰۲ء سے رحم کی کرایہ داری کی قانونی طور پر اجازت ہے۔ ابتدا میں یہ اجازت صرف رضاکارانہ طور پر تھی، معاوضہ حاصل کرنا ممنوع تھا۔ ۲۰۰۸ء میں سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلے کے ذریعے اس کی بھی اجازت دے دی۔ اس کے نتیجے میں مغربی ممالک سے تعلق رکھنے والے اولاد کے خواہش مند افراد بڑے پیمانے پر ہندوستان کا رخ کرنے لگے۔ ان ممالک میں امریکا، برطانیہ، کینیڈا، تائیوان، فرانس اور آسٹریلیا خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک طرف ان لوگوں کو یہ فائدہ ہوا کہ انھیں کم خرچ پر یہ سہولت حاصل ہوگئی۔ کہاں تو ان ممالک میں اس پر ایک لاکھ ڈالر کا صرفہ آتا تھا اور کہاں ہندوستان میں ۱۵ سے ۲۰ ہزار ڈالر میں کام چلنے لگا۔ دوسری طرف ہندوستانی بھی اس منافع بخش کاروبار سے مالا مال ہونے لگے۔ ایک غریب یا اوسط درجے کا ہندوستانی دس سال میں جتنا کچھ کما پاتا ہے، اس کی بیوی ایک بار نو ماہ کے لیے اپنے رحم کو کرایے پر دے کر اتنی رقم حاصل کر لیتی ہے۔ اس چیز نے ہندوستان میں ایک انڈسٹری کی شکل اختیار کرلی ہے، جسے Fertility Tourism Industry کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا شمار بہت تیزی سے ترقی کرنے والی انڈسٹریز میں ہونے

لگا ہے۔ ۲۰۱۱ء کے ایک سروے کے مطابق اس انڈسٹری میں بیس (۲۰) بلین روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ اس صورت حال نے ہندوستان کو Surrogacy Capital of the world کا درجہ دے دیا ہے۔

دوسری عورت کا رحم اجرت پر لینے کے اسباب

بچے کے لیے دوسری عورت کی خدمات حاصل کرنے اور اس کا رحم اجرت پر لینے کے متعدد اسباب ہیں:

۱۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ کسی مرض کی وجہ سے عورت کا رحم نکال دیا گیا ہو، مثلاً اس میں کینسر ہو، یا اس سے مسلسل جریان خون ہو رہا ہو اور کسی بھی طریقے سے وہ رک نہ رہا ہو، یا اس میں رسولی (Tumour) ہو۔

۲۔ عورت کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو، جس کے، اس عورت کے رحم میں استقرار حمل کی صورت میں، جنین میں منتقل ہو جانے کا اندیشہ ہو، مثلاً ایڈز۔

۳۔ عورت کے رحم میں جنین کی پرورش وضع حمل تک صحیح طریقے سے نہ ہو پاتی ہو، جنین بار بار رحم میں مرجاتا ہو یا اس کا اسقاط ہو جاتا ہو۔

۴۔ عورت کی عمر زیادہ ہو گئی ہو، جس کی بنا پر اس کے رحم میں استقرار حمل ممکن نہ ہو۔

۵۔ اپنی جسمانی ساخت اور حسن کی حفاظت یا عیش و عشرت کے لیے بعض عورتیں حمل و وضع حمل کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتیں، اس لیے وہ اس تکنیک سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

۶۔ مغرب میں غیر شادی شدہ مرد یا عورتیں (Single Parents) اس تکنیک کے ذریعے اپنا حیاتیاتی (Biological) بچہ حاصل کرتی ہیں۔

۷۔ ہم جنس پرست افراد (Same Sex Couple) بھی بچہ حاصل کرنے کے لیے اس تکنیک کو استعمال کرتے ہیں۔

قائم مقام مادریت کی صورتیں

قائم مقام مادریت کی بنیادی طور پر چار صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ شوہر نطفہ اور بیوی بیضہ فراہم کرسکتی ہو، لیکن بیوی رحم کے کسی مرض کی وجہ سے حاملہ نہیں ہوسکتی یا ہونا نہیں چاہتی، لہٰذا زوجین کسی دوسری عورت کے رحم کو کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب میں دونوں کے مادوں کا ملاپ کرکے حاصل شدہ جنین کو اس عورت کے رحم میں منتقل کردیا جاتا ہے اور ولادت کے بعد اس بچے کو زوجین کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ اسے Traditional Surrogacy کہا جاتا ہے۔

۲۔ بیوی سے بیضہ بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ شادی شدہ جوڑا اولاد کے لیے کسی دوسری عورت کی خدمات حاصل کرتا ہے، تاکہ شوہر کا نطفہ اس (دوسری عورت) کے بیضہ سے مل کر بصورت جنین اس کے رحم میں پرورش پائے۔ اسے Geostational Surrogacy کا نام دیا گیا ہے۔

۳۔ نہ نطفہ شوہر کا ہو نہ بیضہ بیوی کا۔ نطفہ کسی دوسرے مرد کا اور بیضہ کسی دوسری عورت کا حاصل کیا جائے اور ان کی بارآوری کسی اور عورت کے رحم میں، جسے کرایہ پر حاصل کیا گیا ہو، کی جائے۔ اس کام کے لیے مغرب میں بڑے بڑے کمرشیل اسپرم بینک قائم ہوگئے ہیں۔ اس طرز کے بینک ہندوستان میں بھی وجود میں آگئے ہیں۔

۴۔ بیضہ بیوی کا ہو، لیکن نطفہ شوہر کا نہ ہو۔ اسپرم بینک سے اپنی پسند کا کوئی نطفہ حاصل کرکے اور اسے بیضہ سے بارآور کرا کے استقرار حمل کسی دوسری عورت کے رحم میں کروایا جائے۔ یہ صورت اس وقت اختیار کی جاتی ہے جب شوہر نامرد ہو اور بیوی کا رحم استقرار حمل کے قابل نہ ہو، البتہ اس کا بیضہ صحیح سالم ہو۔

اخلاقی اور تہذیبی جواز؟

ربع صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ مسئلہ عالمی سطح پر ماہرین سماجیات کے درمیان اب تک بحث و گفتگو کا موضوع نہیں بن سکا ہے اور اس کے اخلاقی، سماجی اور تہذیبی مضمرات کا ٹھیک سے جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اسے صرف اس پہلو سے دیکھا گیا ہے کہ جو

جوڑے فطری طریقۂ تولید کے ذریعے اولاد نہیں حاصل کر سکتے یا جو افراد رشتۂ ازدواج میں بندھے بغیر اولاد چاہتے ہیں، اس تکنیک کے ذریعے انھیں اپنی خواہش پوری کرنے کا زریں موقع ہاتھ آگیا ہے۔ لیکن اس کام کے لیے جو عورت اپنا رحم پیش کرتی ہے وہ اس کے عوض چند ٹکے تو پا جاتی ہے، لیکن اپنے رحم میں پرورش پانے والے جنین کو دوسرے شخص کے حوالے کرنے کے جو نفسیاتی اثرات اس پر پڑتے ہیں، ان کا تجزیہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس معاملے میں زیادہ سے زیادہ، غریب عورتوں کے استحصال کے امکان کے پیش نظر تفصیلی قوانین وضع کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور بعض ممالک میں ایسے قوانین منظور بھی ہو گئے ہیں۔ لیکن اس مسئلے پر اس سے زیادہ توجہ دینے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث و مذاکرہ کی ضرورت ہے۔

آئندہ سطور میں اس موضوع پر بحث کی جائے گی کہ اسلام اس پورے معاملہ کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ اور اس کے سلسلے میں اس کا کیا موقف ہے؟

اسلام کی بنیادی تعلیمات

قبل اس کے کہ اس موضوع پر اسلام کے موقف کی براہ راست وضاحت کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے عائلی نظام سے متعلق چند بنیادی تعلیمات بیان کر دی جائیں:

(الف) نکاح۔ توالد و تناسل کا واحد جائز ذریعہ

اسلام نے توالد و تناسل کو رشتۂ ازدواج سے منسلک کیا ہے۔ اس کے نزدیک نسل انسانی میں اضافہ کا فطری طریقہ یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان باہم نکاح ہو اور جائز اور قانونی طریقے سے ان کے درمیان جنسی تعلق قائم ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاۗءً (النساء:۱)

”لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیے۔“

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (النحل:۷۲)

”اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے تمھاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمھیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی چیزیں تمھیں کھانے کو دیں۔“

ناجائز جنسی تعلق کو اسلام میں سراسر حرام قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ○ (بنی اسرائیل:۳۲)

”زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔“

(ب) مرد کے نطفے سے کسی غیر عورت کو بار آور نہیں کیا جاسکتا

اسلامی شریعت کی رُو سے یہ قطعاً ناجائز ہے کہ کسی مرد کے نطفے سے ایسی عورت کو بار آور کیا جائے جو اس سے رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہو۔ حضرت رویفع بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا یحل لامرئ یؤمن باللہ والیوم الآخر أن یسقی ماؤہ زرع غیرہ (۱)

”کسی شخص کے لیے، جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، جائز نہیں ہے کہ اپنے پانی (یعنی مادۂ تولید) سے کسی دوسرے کی کھیتی کو سیراب کرے (یعنی غیر عورت سے مباشرت کرے)۔“

اس حدیث میں اصلاً ’استبراءِ رحم‘ کا حکم بیان ہوا ہے، یعنی اگر کوئی عورت کسی مرد سے حاملہ ہو، تو اس کے وضعِ حمل سے قبل کسی دوسرے مرد کے لیے اس سے مباشرت کرنا جائز نہیں ہے۔ راویِ حدیث حضرت رویفعؓ نے ’ای اتیان الحبالی‘ کے الفاظ سے بھی تشریح کی ہے، لیکن اس حدیث کا عام مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ کسی مرد کے لیے اپنا نطفہ کسی اجنبی عورت کے رحم

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی وطی السبایا، ۲۱۵۸

میں داخل کرنا جائز نہیں ہے۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

> أي يدخل نطفته محل زرع غيره (۱)
>
> ”یعنی (کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ) اپنا نطفہ ایسی جگہ داخل کرے جہاں دوسرے کے بچے کی پرورش ہوتی ہے۔“

(ج) شرم گاہ کی حفاظت

اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۔۔۔ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ
>
> (النور: ۳۰-۳۱)
>
> ”(اے نبی) مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں ۔۔۔ اور (اے نبی) مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔“

دوسری آیت میں یہی بات کھول دی گئی ہے کہ ممانعت اصلاً ناجائز جنسی تعلق کی ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کا ایک وصف یہ بھی بیان کیا گیا ہے:

> وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ ...
>
> (المومنون: ۵-۶)
>
> ”اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے ...“

’شرم گاہوں کی حفاظت‘ میں جہاں یہ بات شامل ہے کہ ماورائے نکاح کسی طرح کا جنسی تعلق قائم نہ کیا جائے، وہیں اس کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے کہ جنسی اعضاء سے کوئی ایسا کام نہ لیا جائے جو فطری طریقۂ تولید کے منافی ہو۔ اسی بنا پر ہم جنسیت (Homosexulity)

---

(۱) شمس الحق عظیم آبادی، عون المعبود شرح سنن ابی داؤد: ۶/ ۱۹۵

استمنا بالید (Masterbation) اور جنسی تسکین کے دیگر غیر فطری طریقوں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔⁽¹⁾

(د) نسب کی حفاظت ضروری ہے

اولاد کی خواہش انسان کی فطری خواہش ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ ...

(آل عمران: ١٤)

"لوگوں کے لیے مرغوبات نفس: عورتیں، اولاد ... بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں۔"

اگر کسی وجہ سے کسی شادی شدہ جوڑے کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے تو اسلام اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی رشتہ دار یا یتیم بچے کو اپنا کر اس کی پرورش کر سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ نسب کی حفاظت پر بہت زور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ کوئی شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا باپ کہے یا کوئی شخص کسی دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد قرار دے۔ احادیث میں ایسا کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے اور اس پر وعید سنائی گئی ہے۔

حضرت واثلہ بن اسقعؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان من اعظم الفری ان یدعی الرجل الی غیر ابیہ⁽²⁾

"سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے۔"

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

لیس من رجل ادّعی لغیر ابیہ وھو یعلمہ الا کفر⁽³⁾

"جس شخص نے جان بوجھ کر اپنی نسبت اپنے باپ کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف کی اس نے کفر کیا۔"

---

(١) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، تفسیر سورۃ المومنون، آیت ٥

(٢) صحیح بخاری، کتاب المناقب، ٣٥٠٩

(٣) صحیح بخاری: ٣٥٠٨

عہد جاہلیت میں کوئی شخص کسی دوسرے کے بچے کو اپنا بیٹا بنا لیتا تھا تو وہ اسی کی طرف منسوب ہو جاتا تھا اور اس کا تعارف اس کے بیٹے کی حیثیت سے ہونے لگتا تھا۔ اس سے روک دیا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی:

> مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ○ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (الاحزاب: ۴-۵)

”اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔“

علامہ قرطبیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

”اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے 'تبنّی' (کسی کو منہ بولا بیٹا بنانا) کا حکم اٹھا لیا اور کسی شخص کو، جو حقیقی بیٹا نہ ہو، بیٹا کہنے سے روک دیا اور اس بات کی طرف رہنمائی کی کہ زیادہ بہتر اور مبنی بر انصاف رویہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کے نسبی باپ کی طرف منسوب کیا جائے“ (۱)

رحم کی کرایہ داری — اسلام کا نقطۂ نظر

رحم کی کرایہ داری کی جو صورتیں رائج ہیں اور جن کا گزشتہ سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے ان میں دینی و شرعی اعتبار سے بڑے مفاسد پائے جاتے ہیں:

---

(۱) الجامع لاحکام القرآن، جلد ۷، ج ۱۴، ص ۸۰۔

۱۔ قرآن میں اہل ایمان مردوں اور عورتوں دونوں کو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ جو عورت اپنے رحم میں کسی غیر مرد کے بار آور نطفہ کی پرورش کرتی ہے وہ اس حکم کو پامال کرتی ہے۔

۲۔ اسلام نے توالد و تناسل کو نکاح کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اس تکنیک کے ذریعے جو عورت اپنے رحم میں کسی مرد کے نطفے کا استقرار کرواتی ہے، اس سے اس کا ازدواجی رشتہ نہیں ہوتا۔

۳۔ اسلام نے نسب کی حفاظت پر بہت زور دیا ہے، جب کہ اس تکنیک کو اختیار کرنے سے اختلاطِ نسب کا قوی شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

۴۔ انسان کا جسم اور اس کے اعضاء اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ انھیں نہ فروخت کیا جا سکتا ہے نہ کرایہ پر اٹھایا جا سکتا ہے۔

۵۔ جو عورت اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتی ہے وہ اگر بے شوہر کی ہے (کہ غیر شادی شدہ یا مطلقہ یا بیوہ ہے) تو سماج میں اس پر بدکاری اور دیگر ناپسندیدہ الزامات لگنے کا قوی اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ان مفاسد کی وجہ سے تمام علماء نے متفقہ طور پر قائم مقام مادریت کی مذکورہ بالا تمام صورتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ موضوع بین الاقوامی فقہ اکیڈمیوں میں بھی زیر بحث رہا ہے اور ان میں بھی ان کی حرمت پر علماء کا اتفاق رہا ہے۔ ان اجلاسوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۔ رابطہ عالم اسلامی کی زیر نگرانی قائم اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کا آٹھواں اجلاس، منعقدہ ۲۸/ ربیع الثانی تا ۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ (۱۹۸۵ء)۔

۔ تنظیم اسلامی کانفرنس کی زیر نگرانی قائم بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کا تیسرا اجلاس منعقدہ عمان مورخہ ۸ تا ۱۳/ صفر ۱۴۰۷ھ (۱۹۸۶ء)

۔ مصر کی مجمع البحوث الاسلامیہ کا اجلاس قاہرہ ۲۰۰۱ء

عالم اسلام کے مشہور فقہاء: ڈاکٹر جاد الحق علی جاد الحق (سابق شیخ الازہر مصر)، ڈاکٹر محمد

سید طنطاوی (شیخ الازہر)، ڈاکٹر یوسف القرضاوی (قطر)، ڈاکٹر مصطفی زرقاء، رکن اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ وغیرہ نے بھی رحم کی کرایہ داری کی مذکورہ بالا تمام صورتوں کو حرام قرار دیا ہے۔(۱)

قائم مقام مادریت کی ایک جائز صورت

ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کی دو بیویاں ہوں۔ ایک بیوی میں بیضہ (Ovum) تو بنتا ہو، لیکن وہ رحم (Uterus) کے کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ اس میں حمل کا استقرار نہ ہو سکتا ہو، اس کا بیضہ لے کر شوہر کے نطفے (Sperm) سے اسے بارآور (Fertilize) کیا جائے، پھر اس کی پرورش دوسری بیوی کے رحم میں ہو۔ کیا اسلامی شریعت اس کی اجازت دیتی ہے؟

تنظیم اسلامی کانفرنس کی زیر نگرانی قائم بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے اجلاس عمان ۱۴۰۷ھ (۱۹۸۶ء) میں اس صورت کو بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کی زیر نگرانی قائم اسلامی فقہ اکیڈمی کے اجلاس مکہ مکرمہ ۱۴۰۳ھ (۱۹۸۴ء) کے شرکاء نے اس صورت کو جائز قرار دیا تھا، لیکن اگلے اجلاس ۱۴۰۵ھ (۱۹۸۵ء) میں اس فیصلے کو واپس لے لیا گیا اور اس صورت کو بھی حرام قرار دے دیا گیا۔ اس کی دلیل یہ دی گئی کہ اس سے اختلاط نسب کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ البتہ ہندوستانی فقہاء اس صورت کے جواز کا رجحان رکھتے ہیں۔ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی نے لکھا ہے:

> ”بیضہ جس عورت سے لیا گیا اگر وہ بھی بیوی ہو اس مرد کی، جس کے نطفہ سے مخلوط کیا گیا ہے اور پھر یہ مرکب جس عورت کے جسم میں داخل کیا گیا ہے وہ بھی اس مرد کی بیوی ہو تو جواز کا امکان ہے، ورنہ نہیں۔“(۲)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے جواز کی ایک صورت یہ بتائی ہے:

> ”شوہر اور اس کی ایک بیوی کا مادہ حاصل کیا جائے اور اس کے آمیزے کو اسی شوہر کی

---

(۱) د۔ محمد الخولی، مقالہ: تاجیر الارحام فی الفقہ الاسلامی، مجلۃ جامعۃ دمشق للعلوم الاقتصادیۃ والقانونیۃ، جلد ۲۷، شمارہ ۳، ۲۰۱۱ء، ص ۲۸۲ـ۲۸۳

(۲) مولانا برہان الدین سنبھلی، موجودہ زمانے کے مسائل کا شرعی حل، ص ۱۸۲

دوسری بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جائے۔ اس لیے کہ اس کی پہلی بیوی زچگی کی متحمل نہ ہو، یا طبی اسباب کی بنا پر تولید کی اہل نہ ہو۔"(۱)

ایک شاذ رائے

اجرت پر رحم مادر کے حصول کی درج بالا صورتوں میں سے پہلی صورت کو بعض علماء نے جائز قرار دیا ہے۔ وہ یہ کہ شوہر نطفہ اور بیوی بیضہ فراہم کر سکتی ہو، لیکن اس کے رحم میں کسی مرض کی وجہ سے بارآور نطفہ کا اس میں استقرار نہ ہو سکتا ہو۔ چنانچہ دونوں کے مادوں کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کر کے کسی دوسری عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جائے اور وہ جنین کی پرورش کر کے ولادت کے بعد بچے کو زوجین کے حوالے کر دے۔ ڈاکٹر عبد المعطی بیومی، رکن مجمع البحوث الاسلامیہ و سابق پرنسپل کلیہ اصول الدین جامعۃ الازہر (مصر) کی رائے میں یہ صورت جائز ہے۔ انھوں نے اسے 'رضاع' کے مسئلے پر قیاس کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح شریعت نے عورت کے لیے اپنے بچے کے علاوہ کسی دوسرے بچے کو دودھ پلانا جائز قرار دیا ہے، وہ بچہ اس کے دودھ سے تغذیہ حاصل کرتا اور پرورش پاتا ہے، اسی طرح جنین کی تشکیل اصلاً شوہر کے نطفہ اور بیوی کے بیضہ سے ہو جاتی ہے، کسی دوسری عورت کا رحم اس کو صرف غذا فراہم کرتا ہے۔ اس لیے اگر کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں، مثلاً یہ کہ اپنا رحم پیش کرنے والی عورت اگر شادی شدہ ہو تو اس زمانے میں اس کا شوہر اس سے مباشرت نہ کرے، تا کہ اختلاط نسب کا خدشہ نہ پایا جائے تو اس صورت کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔(۲)

یہ ایک کمزور رائے ہے۔ اجنبی عورت کے رحم میں جنین کی پرورش کو مسئلہ رضاع پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ رضاع کی اجازت شریعت میں ایک زندہ موجود (بچے) کی زندگی کی حفاظت و بقا کے لیے دی گئی ہے، جب کہ اجنبی عورت کے رحم کو اجرت پر حاصل کر کے ایک نئی زندگی کو وجود میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رضاع کی صورت میں اختلاط نسب کا کوئی امکان

---

(۱) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، حلال وحرام، ص ۳۰۳

(۲) مقالہ: تاجیر الارحام، حوالہ سابق

نہیں ہوتا، جب کہ موخر الذکر صورت میں اختلاطِ نسب کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس رائے کو علماء کے درمیان مقبولیت نہیں حاصل ہوئی ہے۔

اجرت پر رحمِ مادر کے حصول کا معاملہ موجودہ دور کے نئے مسائل میں سے ہے۔ گو یہ پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر رواج پا رہا ہے، لیکن اس میں چوں کہ اسلام کے عائلی نظام سے متعلق متعدد مفاسد پائے جاتے ہیں، اس لیے شرعی اعتبار سے اس کی کوئی صورت اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

ہم جنسیت کا فتنہ

موجودہ دور میں جن منحرف جنسی رویوں کو عالمی سطح پر شہرت ملی ہے، بلکہ ایک گہری سازش کے تحت ان کو ہوا دی گئی ہے اور مختلف حیلوں بہانوں سے ان کے حق میں فضا ہموار کرنے اور قانونی طور پر ان کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ان میں سے ایک گھناؤنا اور قابلِ نفرت رویہ وہ ہے جسے Homosexuality کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اصلاً دو الفاظ سے مرکب ہے۔ Homo قدیم یونانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں Same (یکساں)، جب کہ لفظ Sexus کا تعلق لاطینی زبان سے ہے، جس کے معنی ہیں جنسی خواہش پوری کرنا۔ Homosexuality کا مطلب ہے کسی شخص کا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنی ہی صنف کے کسی فرد کی طرف جنسی میلان رکھنا اور اس کے ذریعے اپنی شہوانی خواہش کی تکمیل کرنا۔ اسے اردو میں ہم جنسیت کہا جاسکتا ہے۔

ہم جنسیت۔ فکر اور فلسفہ

فطرت نے تمام جان دار مخلوقات کو زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ودیعت فرمایا ہے۔ [illegible] وہ ابتدائے آفرینش سے اسی متعین فطری طریقے پر عمل پیرا ہیں اور انھوں نے اس سے سر[illegible]ف نہیں کیا ہے۔ بنی نوع انسانی کو چوں کہ شروع ہی سے ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل [illegible] اس لیے اس کے بعض افراد نے بسا اوقات زندگی کے رویوں میں راہِ فطرت سے انحراف کی [illegible] اپنائی ہے۔ یہ انحراف زندگی کے دیگر معاملات کے ساتھ قضائے شہوت کے

معاملے میں بھی رہا ہے۔ تاریخ انسانی کے بعض ادوار میں ایسے افراد پائے گئے ہیں جو اپنی ہی صنف کے افراد سے جنسی خواہش پوری کرتے تھے، لیکن ایسے افراد کو ہر دور میں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا گیا اور ان کے عمل کو انتہائی مبغوض قرار دیا گیا، بلکہ اسے ذوقِ لطیف ہی پر بار تصور کیا گیا اور ہر ممکن طریقے سے اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی تک دنیا کے تقریباً تمام ہی ملکوں میں اس عمل کو قابل تعزیر جرم سمجھا جاتا تھا، بلکہ بعض ملکوں میں اس کی سزا موت تھی۔

مغرب میں، وہاں کے مخصوص پس منظر میں، جب نام نہاد آزادی، مساوات اور بنیادی انسانی حقوق کی ہوا چلی تو اس کا اثر بہت سی سماجی قدروں پر پڑا اور ان کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ کہا گیا کہ ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے، وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، اس کے فکر اور عمل پر کسی طرح کی پابندی عائد کرنا اس کے حق آزادی کو پامال کرنا ہے اور اس کے کسی عمل کی بنیاد پر اس کے ساتھ دوسرے انسانوں سے مختلف معاملہ کرنا حق مساوات سے مغایر ہے۔ ہم جنسیت کو مغرب میں ایک عمل کے بجائے ایک رویہ (Behaviour) قرار دیا گیا ہے اور اس کے لیے فلسفیانہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں۔

ہم جنسیت پر عمل پیرا افراد (Homosexuals) کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ Lesbian : عورت، جو عورت کی طرف جنسی میلان رکھے۔
۲۔ Gay : مرد، جس کا مرد کی طرف جنسی میلان ہو۔
۳۔ Bisexual : وہ فرد (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) جس کا مرد اور عورت دونوں کی طرف میلان ہو۔ کس صنف کی طرف کتنا میلان ہے؟ اس کو ناپنے کے لیے ایک پیمانہ وضع کیا گیا [illegible] کے موجد کے نام پر Kinsey Scale کا نام دیا گیا۔
۴۔ Transgender : وہ شخص، جس میں مردانہ اور زنانہ، دونوں طرح کی خصوصیات ہوں۔ اسے مخنث یا ہجڑا کہا جاتا ہے۔

ان چاروں گروہوں کے مجموعے کو بہ طور مختصر LGBT کہا جاتا ہے۔ ان میں شامل

تمام افراد کو ایک جماعت (Community) قرار دیا گیا اور ان کے منحرف جنسی میلانات کو فطری قرار دیتے ہوئے ان کے حق میں تحریکیں چلائی گئیں اور قوانین وضع کیے گئے۔

مغرب کی مہم جوئی

ہم جنسیت کو عوام میں بھی گندہ اور گھناؤنا عمل سمجھا جاتا تھا اور ملکوں کے قوانین میں بھی اس پر سخت سزائیں مقرر کی گئی تھیں، اس لیے جو افراد اپنے منحرف رجحانوں کی وجہ سے اس میں مبتلا تھے، وہ اس کے اظہار کی ہمت نہ کر پاتے تھے، لیکن انیسویں صدی عیسوی کے اواخر سے اس کے حق میں فضا ہموار کی جانے لگی۔

سب سے پہلے مرحلے میں اس عمل کے ارتکاب کو قابل سزا جرائم کی فہرست سے نکالا گیا۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں متعدد مغربی ممالک کے قوانین میں ترمیم کی گئی اور اس عمل پر سزا ساقط کی گئی۔ دوسرے مرحلے میں LGBT گروپس نے عوامی سطح پر خود کو منظم کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے انھوں نے متعینہ دنوں میں پبلک مقامات پر مظاہرے کیے، جنھیں Pride Parade کا نام دیا گیا اور کانفرنسیں منعقد کیں، جن کے ذریعے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ پہلے ایسے افراد کو حکومتی، انتظامی اور فوجی مناصب کے لیے نااہل قرار دیا گیا تھا، لیکن ان کی منظم کوشش اور دباؤ کی بنا پر آہستہ آہستہ ان کے حقوق تسلیم کیے جانے لگے اور انھیں ہر منصب کے لیے اہل قرار دیا گیا۔ چنانچہ حکومت، فوج، عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ، ہر سیکٹر میں ایسے افراد ظاہر ہوئے جنھوں نے ہم جنسیت پر عمل پیرا ہونے کا برملا اظہار کیا اور ذرا بھی خفت نہیں محسوس کی۔ تیسرے مرحلے میں ایسے افراد کے لیے ’دائمی رفاقت کے قوانین‘ (Partnership Acts) منظور کیے گئے اور اجازت دی گئی کہ جس طرح مخالف صنفوں کے افراد (Hetrosexuals) رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر ایک جوڑے کی شکل میں رہتے اور مختلف سماجی اور تمدنی حقوق سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اسی طرح ہم جنسیت پر عامل افراد بھی پارٹنر کی حیثیت سے خود کو رجسٹرڈ کرا سکتے ہیں اور اس کی بنیاد پر ملکیت، وراثت، امیگریشن، ٹیکس اور سوشل سیکیوریٹی کے حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے جوڑوں کو بچوں کو گود لینے (Adaption)

کا بھی حق دیا گیا۔ اس طرح ہم جنسیت کے معاملے میں گزشتہ سو سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ ۔

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا

ہندوستان کا حال

ہندوستان کا شمار بھی ایسے ممالک میں ہوتا ہے، جہاں زمانۂ قدیم سے ہم جنسیت کو قابل نفرت عمل سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ جب قوانین کی تدوین ہوئی تو اسے موجب تعزیر جرائم کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ ۱۸۶۱ء میں تشکیل پانے والے تعزیرات ہند (Indian Penal Code) کی دفعہ ۳۷۷ میں ہم جنسیت کو ایک غیر قانونی فعل اور جرم قرار دیا گیا، جس پر دس سال سے عمر قید تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔

دنیا کے دیگر ممالک میں فضا بدلی تو اس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑنے لگے اور مختلف اطراف سے یہاں بھی ہم جنسیت کو جرائم کی فہرست سے خارج کرنے اور اسے قانونی جواز فراہم کرنے کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ اقوام متحدہ (United Nations Organisation) کی جانب سے حکومتِ ہند سے اس دفعہ کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا، تاکہ HIV/AIDS کے خلاف لڑنے میں آسانی ہو۔ لا کمیشن آف انڈیا نے ۲۰۰۰ء میں اپنی ۱۷۲ویں رپورٹ میں قانون کی اس دفعہ کو منسوخ کرنے کی سفارش کی۔ اس مہم میں تیزی اس وقت آئی جب ایک سماجی تنظیم ناز فاؤنڈیشن نے دسمبر ۲۰۰۲ء نے تعزیرات ہند کی مذکورہ دفعہ کو ختم کرنے کے لیے دہلی ہائی کورٹ میں مفاد عامہ کی عرضی داخل کی۔ کورٹ نے ۲۰۰۴ء میں اس عرضی کو خارج کر دیا تو اس کے خلاف فاؤنڈیشن نے سپریم کورٹ میں اپیل کی، جس پر اسے دوبارہ ہائی کورٹ میں لوٹا دیا گیا۔ اس کے بعد فیصلے پر اثر انداز ہونے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی گئیں۔ ایک طرف مختلف طبقات کے بعض سربرآوردہ افراد کی طرف سے ہم جنسیت کی حمایت کی گئی، دوسری طرف حکومت کے مختلف وزراء نے وقتاً فوقتاً بیانات جاری کیے کہ اس دفعہ کو ختم کرنا حکومت کے زیر غور ہے اور اس پر رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ تیسری طرف ملک کے بڑے شہروں، مثلاً دہلی، بنگلور، کلکتہ، چنئی، ممبئی وغیرہ میں Gay Pride Parade کے نام

سے ہم جنسیت کے حامی افراد کے مظاہرے کرائے گئے۔ بالآخر ۲؍جولائی ۲۰۰۹ء میں دہلی ہائی کورٹ نے IPC کی دفعہ ۳۷۷ کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے ہم جنسیت کو قانونی جواز فراہم کر دیا۔

اس فیصلے نے ہم جنسیت کے حامی افراد میں خوشی کی لہر دوڑا دی اور ان کی سرگرمیاں مزید تیز ہو گئیں۔ Pink Page کے نام سے پہلا آن لائن LGBT Magazine شائع ہوا اور Bombay Dost کے نام سے Gay Magazine کا دوبارہ اجراء ہوا۔ مختلف ریاستوں میں LGBT Pride Parade کا انعقاد ہونے لگا۔ دوسری طرف ملک کی مختلف مذہبی تنظیموں اور سماجی اداروں نے مل کر ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کر دی۔ فریقین کے دلائل سننے اور مقدمہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد سپریم کورٹ نے ۲۷؍مارچ ۲۰۱۲ء کو فیصلہ محفوظ کر لیا۔ اس فیصلے کو اس نے ۱۱؍دسمبر ۲۰۱۳ء کو سنایا۔ اس میں دہلی ہائی کورٹ کے فیصلے کو کالعدم کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تعزیرات ہند کی مذکورہ دفعہ میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اس کے مطابق یہ خلاف فطرت عمل قابل تعزیر جرم ہے۔ ساتھ ہی عدالت عالیہ نے یہ بھی کہا کہ قانون بنانا حکومت کا کام ہے۔ اگر وہ چاہے تو پارلیمنٹ سے قانون منظور کر کے اس دفعہ کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اس فیصلے نے بحث و مباحثہ کا دروازہ کھول دیا ہے اور اس کے حق میں اور مخالفت میں دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔

کیا ہم جنسیت پر پابندی بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے؟

ہم جنسیت کے حامی بڑے زور و شور سے یہ بات کہتے ہیں اور اسی کو دہلی ہائی کورٹ کے فاضل جج نے بھی دہرایا ہے کہ ہم جنسیت پر پابندی آزادی، عدم تفریق اور مساوات کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے، جن کی دستور ہند میں ضمانت دی گئی ہے۔ دستور کی دفعہ چودہ (۱۴) تمام افراد کے درمیان مساوات کو لازم کرتی ہے اور دفعہ اکیس (۲۱) ہر فرد کی ذاتی زندگی کو تحفظ فراہم کرتی ہے، جب کہ دفعہ پندرہ (۱۵) میں کہا گیا ہے کہ مذہب، نسل، ذات، جنس یا جائے پیدائش کی بنیاد پر کسی فرد کے معاملے میں تفریق نہیں برتی جائے گی۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس پابندی کو بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ متمدن انسانی سماج میں کسی فرد کو بے قید آزادی کی اجازت نہیں دی جاسکتی، بلکہ اسے سماج کی مسلّم قدروں اور طے شدہ ضابطوں کی پابندی کرنی ہوگی۔ مثلاً کوئی شخص مادر زاد برہنہ ہوکر گھر سے باہر نکلنے اور پبلک مقامات میں جانے کو اپنا حق گردانے تو اس کی بات تسلیم نہیں کی جائے گی اور اسے اس حرکت سے روکا جائے گا۔ اس معاملے میں مساوات اور عدم تفریق کے حقوق کا حوالہ دینا بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ جو شخص اس گھناؤنے عمل میں ملوث ہو، اسے اس سے روکنے کے علاوہ، بہ حیثیت انسان جو بنیادی حقوق اسے ملنے چاہئیں، ان سے نہ اس کو محروم کیا جاتا ہے اور نہ اس کی انسانیت کی تحقیر و تذلیل کی جاتی ہے۔

باہم رضامندی کا غلط تصور

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ اگر دو افراد باہم رضامندی (Mutual Consent) سے ایک دوسرے سے جنسی لذت حاصل کر رہے ہیں تو اس میں کسی دوسرے کا کیا جاتا ہے؟ یہ رضامندی دو الگ الگ صنفوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان بھی ہوسکتی ہے اور ایک ہی صنف کے دو افراد کے درمیان بھی۔ جس طرح کسی مرد اور عورت کے درمیان باہم رضامندی سے جنسی تعلق (Consensual Sex) پر کوئی پابندی نہیں ہے اور اسے قابل تعزیر جرم نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح اس صورت میں بھی اس کی اجازت ہونی چاہیے، جب دو مرد یا دو عورتیں باہم رضامندی سے اس فعل کو انجام دیں۔

کسی متمدن سماج میں باہم رضامندی کا یہ تصور قابل قبول نہیں ہے، بلکہ اسے سماجی نظم وضبط کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا اور یہ دیکھا جائے گا کہ اس کی وجہ سے نظام تمدن میں خلل تو نہیں پیدا ہو رہا ہے اور سماج کا شیرازہ تو نہیں منتشر ہو رہا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے رشوت کا لین دین دو افراد کی باہم رضامندی سے ہوتا ہے، لیکن اسے جرم سمجھا جاتا ہے اور پکڑے جانے پر سخت سزا دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انھیں اس کی اجازت دے دی جائے تو لوٹ کھسوٹ، بے ایمانی اور حقوق کی پامالی عام ہونے لگے گی اور پورا سماج فتنہ و فساد سے بھر جائے گا۔

اسی طرح جہیز کا لین دین عموماً باہم رضامندی سے ہوتا ہے لیکن اسے سماج میں اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اس سے باز رکھنے کے لیے مختلف قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ اسی پر دیگر سماجی برائیوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کسی برائی کو قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ اسے دو افراد نے باہم رضامندی سے انجام دیا ہے۔

کیا یہ ذہنیت موروثی ہے؟

کہا جاتا ہے کہ اپنی ہی صنف کی طرف جنسی میلان (Sexual Orientation) موروثی (Genetic) اور خلقی (Congenital) ہوتا ہے۔ اس کی تعیین دوران حمل، بلکہ استقرار حمل کے ابتدائی دنوں ہی میں ہو جاتی ہے۔ اس کے ذمے دار بعض جین (Gene) ہوتے ہیں، جو جسم انسانی میں پائے جاتے ہیں۔ وہی انسان کی عادات و اطوار اور ذہن و مزاج کی تشکیل کرتے ہیں۔

یہ بات کسی حد تک درست ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی کے تجربات اور اس کے ارد گرد کا ماحول اس کے جینیاتی کوڈ (Genetic Code) کے برتاؤ کو متاثر کرتا ہے اور بدلتے ماحول میں مختلف جین کبھی فعالیت اور کبھی عدم فعالیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

بالفرض اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی سماج کے تحفظ کے لیے اس ذہنیت کو پنپنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ بعض افراد میں جینس کے سبب ہی دہشت گردی یا خودکشی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان رجحانات کے حامل افراد کو نہ ان مجرمانہ افعال کی کھلے عام چھوٹ دی جاتی ہے اور نہ ان کا ارتکاب کرنے پر انھیں سزا سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔

نفسیاتی مرض

ہم جنسیت کے رجحان کو مغرب میں پہلے نفسیاتی امراض میں شمار کیا جاتا تھا۔ American Psychiatric Association نے ۱۹۵۲ء میں نفسیاتی امراض پر اپنا پہلا

کتابچہ Diagnostic and Statistical Mannual of Mental Disorders کے نام سے شائع کیا تو اس میں ہم جنسیت کو بھی شامل کیا، لیکن جب اس پر تنقید کی جانے لگی تو بالآخر ۱۹۷۳ء میں اسے اس فہرست سے خارج کر دیا۔ عالمی ادارۂ صحت (World Health Organisation) نے بھی ۱۹۷۷ء میں اپنی رپورٹ ICD-9 میں ہم جنسیت کو نفسیاتی مرض قرار دیا، لیکن ۱۹۹۰ء میں منعقد ہونے والی 43th World Health Assembly کی سفارش کے بعد ICD-10 میں اسے نفسیاتی امراض کی فہرست سے نکال دیا۔ یہی معاملہ چین میں روا رکھا گیا۔ Chinese Society of Psychiatry نے ۱۹۹۶ء میں ہم جنسیت کا شمار نفسیاتی امراض میں کیا، پھر پانچ سال کے بعد اسے اس فہرست سے خارج کر دیا۔

صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے ہم جنسیت کو نفسیاتی مرض تسلیم کرنا، پھر اس کا انکار کر دینا ہم جنسیت کے حامیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کے معاملے میں روز افزوں دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اسے مرض ہی کی حیثیت دی جانی چاہیے اور اگر اس کا رجحان بچپن ہی سے دکھائی دے تو اس کا شمار پیدائشی اور خلقی امراض میں کرنا چاہیے۔

بعض بچے پیدائشی طور پر معذور ہوتے ہیں یا ان کے کسی عضو میں نقص ہوتا ہے، مثلاً کسی کے ہاتھ یا پیر میں چھ انگلیاں ہوتی ہیں، یا ہونٹ کٹا ہوتا ہے، یا سر غیر معمولی طور پر بڑا ہوتا ہے، یا ہارمونس کے عدم توازن کی وجہ سے جسمانی نشوونما معمول سے کم ہوتی ہے۔ ان صورتوں میں ان بچوں کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا جاتا کہ وہ تو ایسے ہی پیدا ہوئے ہیں، بلکہ ان کا علاج کر کے انھیں معمول کی زندگی گزارنے کے لائق بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر بعض افراد پیدائشی طور پر ہم جنسیت کی طرف میلان رکھتے ہوں تو ان کے اس رویے کو خلقی نقص (Congenital Abnormality) سمجھتے ہوئے اس کا علاج کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، نہ کہ ان کی اس ذہنیت کو پروان چڑھایا جائے اور اس کی حمایت میں قوانین وضع کیے جائیں۔

نظامِ فطرت سے بغاوت

ہم جنسیت نظامِ فطرت سے بغاوت اور اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ ابتدائے

آفرینش سے کائنات کی تمام اشیاء میں 'زوجیت' کا قانون جاری و ساری ہے۔ نہ صرف حیوانات اور نباتات میں، بلکہ بے جان مادوں میں بھی یہ اصول کارفرما ہے۔ خود مادہ (Atom) کی بنیادی ترکیب میں منفی اور مثبت برقی توانائی پائی جاتی ہے۔ ذی حیات انواع میں نر اور مادہ کا فرق فطرت نے بقائے نوع اور تناسل کے لیے رکھا ہے۔ دونوں کی یکجائی سے ان کی نسل چلتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ان کے درمیان کشش رکھی گئی ہے۔

نوعِ انسانی میں اسی مقصد کے لیے مرد اور عورت کی دو الگ الگ صنفیں بنائی گئی ہیں۔ ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف کشش محسوس کرتے ہیں۔ ان کے درمیان جنسی تعلق کے نتیجے میں توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس تعلق میں جو لذت رکھی گئی ہے وہ فطرت کے اس منشا کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تحریک بھی فراہم کرتی ہے اور اس خدمت کا صلہ بھی ہے۔

جو شخص فطرت کی اس اسکیم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے ہی ہم جنس سے شہوانی لذت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ حقیقت میں فطرت سے جنگ کرتا ہے۔ یہ جنگ اس کی اور اس کے رفیق (Partner) کی جسمانی ساخت اور نفسیات دونوں پر برے اثرات ڈالتی ہے، اس لیے کہ وہ ان سے وہ کام لینا چاہتا ہے جس کے لیے انھیں بنایا ہی نہیں گیا ہے۔ اسی طرح ایسا شخص درحقیقت فطرت سے غداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فطرت نے شہوانی لذت کو نسل انسانی کے استمرار و تسلسل کی اہم خدمت کا ذریعہ بنایا ہے، جب کہ وہ اس خدمت کو انجام دیے بغیر لذت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

خاندان اور تمدن کی پامالی

سماج کے بنائے گئے ضابطوں کے مطابق جب مرد اور عورت اکٹھا ہوتے ہیں تو ان سے ایک خاندان تشکیل پاتا ہے، اولاد کی پیدائش اور پرورش ہوتی ہے، رشتے ناتے وجود میں آتے ہیں، تمدن پروان چڑھتا ہے اور سماج کے تمام افراد اپنا اپنا کردار انجام دیتے ہیں۔ لیکن ہم جنسیت سے خاندان کے ادارے پر کاری ضرب لگتی ہے۔ اس لیے کہ جنس فطری طریقے سے

خاندان کی تشکیل ہونی چاہیے، اس میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم جنسیت میں مبتلا شخص صنفِ مخالف سے نکاح کر کے نوعِ انسانی کے تسلسل کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری انجام دینے سے جی چراتا ہے اور خاندان وجود میں لانے اور اس کے متعلقہ افراد کی خدمت کرنے سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ وہ تمدن کے تمام اداروں سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن اسے ترقی دینے کے لیے کوئی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتا۔ ہم جنسیت کی حمایت گویا ادارۂ خاندان کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش اور نظامِ تمدن پر انتہائی مہلک وار ہے۔ اس کے نتیجے میں قوی اندیشہ ہے کہ سماج کے تانے بانے بکھر جائیں اور تمدن کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ جائے۔

ہم جنسیت کے حامی افراد کا مطالبہ ہے کہ انھیں آپس میں 'نکاح' کرنے کی اجازت دی جائے اور اس کے نتیجے میں انھیں وہ تمام سہولیات فراہم کی جائیں جو نکاح کے بندھن میں بندھنے کے بعد ایک جوڑے کو ملتی ہیں۔ اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کا مطلب ادارۂ نکاح پر کاری ضرب لگانا اور اس کی اہمیت کو ختم کرنا ہے۔ بعض ممالک میں اس مطالبے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا گیا ہے اور قانونی طور پر ان کے وہ تمام حقوق منظور کر لیے گئے ہیں جو نکاح کے بعد ایک جوڑے کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان ممالک میں نکاح کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے، جنسی زندگی میں انتشار برپا ہے، لوگ مالی اور مادی منفعتوں کی بنیاد پر اکٹھا ہوتے ہیں، اپنی شہوانی خواہشات پوری کرتے ہیں، جب تک چاہتے ہیں ساتھ رہتے ہیں اور جب چاہتے ہیں الگ ہو جاتے ہیں۔ بے قید آزادی، خواہشاتِ نفس کی غلامی اور منفعت پرستی نے ان کے سماج کو حیوانات کے باڑے میں تبدیل کر دیا ہے۔

صحتِ عامہ کو خطرہ

ہم جنسیت کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے صحتِ عامہ کو سنگین خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس سے وہ لوگ تو جسمانی اور نفسیاتی طور پر متاثر ہوتے ہی ہیں جو اس لعبِ بد میں مبتلا ہوتے ہیں، ساتھ ہی اس کے بھیانک اثرات ان بہت سے افراد پر بھی پڑتے ہیں جو ان کے ارد گرد رہتے ہیں یا ان کے رابطے میں آتے ہیں۔

گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی میں بعض مغربی ممالک میں ہونے والے سروے سے انکشاف ہوا ہے کہ ہم جنسیت میں مبتلا مردوں کی عمر کا اوسط پچاس سال سے کم ہے، جو کہ مجموعی آبادی کی اوسط عمر سے بیس سال کم ہے۔ ۲۰۰۲ء میں ہونے والے ایک سروے کا نتیجہ دونوں کی عمروں میں تیس (۳۰) سال فرق کی صورت میں ظاہر ہوا۔

ہم جنسیت اپنے ساتھ بہت سے متعدی اور غیر متعدی امراض کا تحفہ لاتی ہے۔ ان کا شکار اس کے عادی مجرم خود بھی ہوتے ہیں اور وہ لوگ بھی ان کی لپیٹ میں آتے ہیں جو ان کے رابطے میں رہتے ہیں۔ مثلاً بواسیر دموی (Hemorrhoids)، انشقاق مقعد (Anal Fissure)، جراحتِ مقعدی مستقیمی (Anorectal Trauma)، سرطانِ مقعد (Anal Cancer)، آتشک (Syphilis)، سوزاک (Gonorrhoea)، التہاب کبد (Hepatitis B&C) اور دیگر بہت سی جنسی اور غیر جنسی بیماریاں۔

موجودہ دور میں ایڈز (AIDS) نے عالمی سطح پر ایک سنگین وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لاکھوں افراد اس کے نتیجے میں لقمۂ اجل بن چکے ہیں اور اس کے شکار افراد کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ میڈیکل سائنس کی غیر معمولی ترقی کے باوجود اب تک اس مہلک مرض کا کوئی شافی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ سروے رپورٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنسیت میں مبتلا افراد عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے ایڈز کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا کے تمام ممالک میں ہم جنسیت میں مبتلا افراد کی جانب سے خون کا عطیہ (Blood Donation) قبول نہیں کیا جاتا۔

ایڈز کی روک تھام کے لیے اقوامِ متحدہ کی جانب سے دنیا کے تمام ممالک میں کچھ عرصے سے زبردست مہم جاری ہے اور مختلف تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ ان کوششوں کے کچھ اثرات سامنے آئے ہیں اور اس سے متاثر ہونے والوں کی تعداد دن بہ دن کم ہو رہی ہے، لیکن رپورٹس بتاتی ہیں کہ ہم جنسیت میں مبتلا مردوں میں HIV/AIDS کی موجودگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایڈز کے کنٹرول کے لیے عالمی سطح پر سرگرم اقوامِ متحدہ کی تنظیم UNAIDS کی ۲۰۱۳ء کی رپورٹ میں صراحت سے کہا گیا ہے:

> “Although the incidence of HIV infection is declining in most regions of the world, the incidence among men who have sex with men appears to be rising in several places - including in Asia, where this mode of transmission is a major contributor to the HIV epidemics of several countries. Globally, men who have sex with men are estimated to be 13 times more likely to be living with HIV than the general population”.(۱)

“اگرچہ HIV سے متاثر ہونے کے واقعات میں دنیا کے بیشتر علاقوں میں برابر کمی آرہی ہے، لیکن بہت سے مقامات پر ہم جنسیت میں مبتلا مردوں کے اس مرض کا شکار ہونے کے واقعات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، بالخصوص براعظم ایشیا میں، جہاں کے متعدد ممالک میں HIV کے وبائی صورت اختیار کرنے کا ایک بڑا سبب ہم جنسیت ہے۔ عالمی سطح پر دیکھا جائے تو جو مرد اپنی ہی جنس سے شہوانی تعلق قائم کرتے ہیں وہ عام آبادی کے مقابلے میں HIV سے تیرہ (۱۳) گنا زیادہ متاثر ہیں”۔

سرمایہ دارانہ استعمار کی سازش

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم جنسیت سماج کے لیے اتنی ہی خطرناک ہے اور انسانی آبادی پر اس کے اتنے بھیانک اثرات مرتب ہو رہے ہیں تو پوری دنیا میں اسے کیوں بڑھاوا دیا جا رہا ہے؟ سو (۱۰۰) سے زیادہ ممالک میں اسے قابل تعزیر جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے اور ہم جنسیت میں مبتلا افراد کے لیے سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے قوانین وضع کیے جا رہے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آج کل دنیا پر اصلاً سرمایہ داروں کی حکم رانی ہے۔ ان ہی کے اشارے پر ممالک کی پالیسیاں وضع کی جاتی ہیں۔ جن کاموں میں سرمایہ داروں کا فائدہ ہوتا ہے انھیں فروغ دیا جاتا ہے اور جن چیزوں میں ان کا فائدہ نہیں ہوتا ان کی ہمت شکنی کی جاتی ہے۔ ہم

---

(۱) AIDS by the numbers, P6

جنسیت نے موجودہ دور میں عالمی سطح پر بہت بڑی انڈسٹری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مختلف ممالک میں ہم جنسیت میں مبتلا افراد کے لیے مخصوص بڑے بڑے ہوٹل (Resort) قائم کیے گئے ہیں، ان کے کلب (Gay clubs) چل رہے ہیں، بڑے پیمانے پر ان سے متعلق لٹریچر (Gay Literature) شائع ہو رہا ہے، وقتاً فوقتاً ان کے مظاہرے اور ریلیاں (LGBT Pride Parade) منعقد ہوتی ہیں، اسی طرح جشن و مستی کے دیگر پروگرام اور تقریبات ہوتی ہیں۔ اس میں سرمایہ داروں کا اربوں (Billions)، کھربوں (Trillions) ڈالر کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ ہم جنسیت کو بڑھاوا ملے، تاکہ ان کا کاروبار چمکے اور ان کے سرمایہ میں اضافہ ہو۔

تمام مذاہب ہم جنسیت کے خلاف ہیں

ہم جنسیت کی انھی مضرتوں اور قباحتوں کی وجہ سے دنیا کے تمام مذاہب اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے انسانیت کے خلاف جرم سمجھتے ہیں۔ یورپی ممالک میں اس وبا کے عام ہونے کی وجہ سے کلیساؤں سے تعلق رکھنے والے مذہبی پیشوا بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہے ہیں، اس بنا پر عیسائیت کے پیروکاروں نے عملی طور پر اس کے معاملے میں کچھ نرمی دکھائی ہے، لیکن مذہبی طور پر اس میں بھی اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوستان کے تمام مذاہب: ہندومت، جین مت، بدھ مت، سکھ مت وغیرہ بھی اس کے عدم جواز پر متفق ہیں۔

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کے بہتر (۷۲) ممالک میں ہم جنسیت کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض میں اس کی سزا موت ہے۔ ان میں سے بیش تر مسلم ممالک ہیں یا ان کی آبادی کی اکثریت کسی دوسرے مذہب پر عمل پیرا ہے۔

ہم جنسیت کے بارے میں اسلام کا موقف بالکل واضح ہے۔ اس نے سخت الفاظ میں اس کی مذمت کی ہے، اس کی روک تھام کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے عبرت ناک سزا تجویز کی ہے۔ آئندہ سطور میں اس پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

اسلام کا نظریہ جنس

اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو جوڑے جوڑے بنایا ہے (الذاریات:۴۹)۔ یہ قانونِ زوجیت نباتات، حیوانات اور نوعِ انسانی میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہر نوع میں اضافہ ہو اور اس کی نسل پھلے پھولے۔ قرآن کریم میں ہے:

> سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (یٰس:۳۶)

"پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے، خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔"

> فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا یَذْرَؤُكُمْ فِیْهِ (الشوریٰ:۱۱)

"آسمانوں اور زمین کا بنانے والا، جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے اور اسی طرح جانوروں میں بھی (انہی کے ہم جنس) جوڑے بنائے اور اس طریقے سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے۔"

اسلام جنسی تعلق کا ایک مقصد جہاں یہ قرار دیتا ہے کہ اس سے زوجین ایک دوسرے سے سکون حاصل کریں اور ان کے درمیان محبت و مودت کی فضا قائم ہو، وہیں دوسرا اہم مقصد وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کے ذریعے اولاد کی پیدائش ہو اور نسل چلے۔ قرآن میں بیویوں کے ساتھ جنسی تعلق کے ذیل میں صاف الفاظ میں یہ دوسرا مقصد حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (البقرۃ:۱۸۷)

"ان سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو چیز تمہارے لیے لکھ رکھی ہے اس کو طلب کرو۔"

اس آیت کی تفسیر میں علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے:

> ای لا تباشروا لقضاء الشھوۃ وحدھا ولکن لابتغاء ما وضع اللہ لہ النکاح من التناسل(۱)
>
> "یعنی ان سے محض قضائے شہوت کے لیے مباشرت نہ کرو، بلکہ اللہ نے نکاح کو جس لیے مشروع کیا ہے، یعنی تناسل، اس کو پیش نظر رکھو۔"

اور علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

> "اس آیت سے اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ جنسی تعلق قائم کرنے والے کو چاہیے کہ اس کے ذریعے نسل کی حفاظت کا ارادہ کرے، نہ کہ صرف قضائے شہوت اس کے پیش نظر ہو۔ اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمارے اندر جماع کی خواہش ہماری نوع کی بقا کے لیے رکھی ہے، جس طرح اس نے ہمارے اندر کھانے کی خواہش ہمارے جسموں کی بقا کے لیے رکھی ہے۔"(۲)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ (البقرۃ: ۲۲۳)
>
> "تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ تمھیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ، مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو۔"

مفسرین نے آیت کے ٹکڑے (وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ) کے متعدد مفہوم بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں جنسی تعلق کے ذریعے اولاد اور نسل چاہنے کا حکم دیا گیا ہے۔(۳)

---

(۱) زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۲۶۶۔ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، عکرمہؒ، ضحاکؒ اور سدیؒ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ دیگر مفسرین نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ ملاحظہ کیجیے ماوردی، رازی، بیضاوی، ابن کثیر کی کتابوں میں مذکورہ آیت کی تفسیر

(۲) آلوسی، روح المعانی: ۱/ ۳۲۲

(۳) ملاحظہ کیجیے زمخشری، بغوی، بیضاوی، ابن عطیہ، ابوحیان اور قرطبی کی کتابوں میں مذکورہ آیت کی تفسیر

قوم لوط سے عبرت پذیری

قرآن کریم میں گزشتہ قوموں میں سے ایک قوم کا تذکرہ کیا گیا ہے، جس کی طرف اللہ کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ یہ قوم شرک اور بت پرستی کے علاوہ دیگر بہت سی برائیوں کا شکار تھی۔ اس کی سب سے بڑی برائی یہ تھی کہ وہ ہم جنسیت میں مبتلا تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اس کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی، برائیوں سے اجتناب کرنے کی تلقین کی، ساتھ ہی اس گھناؤنی برائی کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی اور اس کے برے انجام سے ڈرایا۔ انھوں نے فرمایا:

> اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۚ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۝ (الاعراف: ۸۰-۸۱)
>
> ”کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔“

دوسری جگہ ان کی تنبیہ ان الفاظ میں مذکور ہے:

> اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ۝ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ۝ (الشعراء: ۱۶۵-۱۶۶)
>
> ”کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمھاری بیویوں میں تمھارے رب نے تمھارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو۔“

حضرت لوطؑ کی تنبیہ کا ان کی قوم پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ حسب سابق اس برائی میں لت پت رہی، بلکہ اسے اپنے درمیان حضرت لوطؑ کا وجود شاق گزرنے لگا، اس لیے کہ وہ برابر اس کی

سرزنش کرتے رہتے تھے۔ اس نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ ”یہ لوگ بڑے پاک باز بنتے ہیں، انھیں بستی سے نکال باہر کرو“ (النمل:۵۶)

بالآخر جب ہزارہا تنبیہات کے باوجود ان پر کچھ اثر نہ ہوا، وہ اپنی روش سے باز نہ آئے اور ان پر حجت تمام ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آگیا اور انھیں ان کے کرتوتوں کی پاداش میں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا گیا۔ ان پر عذاب کی تفصیل قرآن میں متعدد مقامات پر مذکور ہے۔ سورۂ ہود میں ہے:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝ (ہود:۸۲-۸۳)

”پھر جب ہمارے فیصلہ کا وقت آپہنچا تو ہم نے اُس بستی کو تل پٹ کر دیا اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے، جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں ہے۔“

قومِ لوط بحیرۂ مردار (Dead sea) کے جنوب مشرق میں سدوم، عمورہ، ادمہ، ضبوئیم اور ضغر نامی شہروں میں آباد تھی۔ ساحل سمندر پر یہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا، لیکن عذابِ خداوندی کے نتیجے میں ایسا تباہ و برباد ہوا کہ سیکڑوں سال گزر جانے کے باوجود آج تک وہاں کی ویرانی اور نحوست ختم نہیں ہوئی۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ نے لکھا ہے:

”اردن کی وہ جانب جہاں آج بحر میت یا بحر لوط واقع ہے، یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عمارہ کی بستیاں آباد تھیں۔ اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ، جو اب سمندر نظر آتا ہے، کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے۔ سدوم و عمارہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے سمندر نہیں تھا، بلکہ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ الٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور

بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا۔

اسی لیے اس کا نام بحر میت اور بحر لوط ہے۔"(۱)

مفسرین کرام نے آیت کے آخری ٹکڑے (وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ) کے دو مفہوم بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ سزا پانے والی یہ بستیاں اہل مکہ سے (جو ظلم کی روش پر قائم تھے) دور نہیں ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ کہ یہ قوم اپنے فعل بد کی وجہ سے جس انجام سے دوچار ہوئی، بعید نہیں کہ ویسا ہی انجام ہر اس قوم کا ہو جو ان کے جیسا کام کرے۔ علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

أي وما هذه النقمة ممن تشبه بهم في ظلمهم ببعيد عنه(۲)

"یعنی جو لوگ قوم لوط کی جیسی غلط کاری میں ملوث ہوں، ان کو بھی اسی طرح کی سزا ملنا بعید نہیں ہے۔"

حضرت ابن عباسؓ سے اس کی یہ تشریح مروی ہے:

إن المعنى وما عقوبتهم ممن يعمل عملهم ببعيد(۳)

"اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان کے جیسا کام کریں گے، بعید نہیں کہ ان کو بھی یہی سزا ملے۔"

علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں:

وفيه وعيد لكل ظالم(۴)

"اس میں ہر اس شخص کے لیے وعید ہے جو ایسا غلط کام کرے۔"

رسول اللہ ﷺ کی تنبیہات

اسلام میں ہم جنسیت کو کتنا شنیع عمل سمجھا گیا ہے، اس کا اندازہ درج ذیل احادیث نبوی

---

(۱) مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، قصص القرآن: ۱/ ۵۹۵-۵۹۶، بحوالہ بستانی ۹/ [illegible]

(۲) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۲/ ۳۵۱

(۳) آلوسی، روح المعانی: ۲/ ۳۰۱

(۴) بیضاوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل: ۱/ ۴۶۵

سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے چند کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کا تذکرہ الگ الگ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ ان میں اس شخص کا بھی ذکر تھا جو ہم جنسیت میں مبتلا ہو۔ آپ نے فرمایا:

لعن اللہ من عمل عمل قوم لوط(۱)

”اللہ کی لعنت ہے اس شخص پر جو قوم لوط کا سا عمل کرے۔“

حدیث میں ہے کہ آپ نے یہ جملہ تین بار دہرایا، جب کہ دیگر افراد کے سلسلے میں بارگاہِ الٰہی میں ان کے لعنت زدہ ہونے کا ذکر صرف ایک ایک مرتبہ فرمایا۔

حضرت ابن عباسؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من وجدتموہ یعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ(۲)

”اگر تم کسی شخص کو عمل قوم لوط کرتے ہوئے دیکھو تو کرنے والے اور کروانے والے دونوں کو قتل کردو۔“

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے عمل قوم لوط انجام دینے والوں کے بارے میں فرمایا:

ارجموا الأعلی والأسفل ارجموھما جمیعاً(۳)

”جو شخص اوپر ہو اور جو نیچے، دونوں کو سنگسار کردو۔“

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) مسند احمد ۱/ ۳۰۹، حدیث نمبر ۲۸۱۷، مستدرک حاکم، ۴/ ۳۵۶۔ جامع ترمذی (۱۴۵۶) میں یہ روایت ان الفاظ میں ہے: ملعون من عمل عمل قوم لوط۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الحدود ۴۴۶۲، جامع ترمذی: ۱۴۵۶، سنن ابن ماجہ: ۲۵۶۱، مسند احمد: ۱/ ۳۰۰، حدیث نمبر ۲۷۲۷۔ علامہ البانی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، ۲۵۶۲

لا ینظر اللہ الی رجل أتی رجلاً أو امرأۃ فی الدبر(۱)

"اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر نہیں اٹھائے گا جو کسی مرد یا عورت کی پیچھے کی شرم گاہ سے اپنی شہوت پوری کرے۔"

اسلامی شریعت اس معاملے میں اتنی حساس ہے کہ وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی مرد کسی دوسرے مرد کا ستر دیکھے، اسی طرح کوئی عورت کسی دوسرے عورت کے ستر کی طرف نگاہ اٹھائے، یا مرد مرد کے ساتھ اور عورت عورت کے ساتھ، بے لباسی کی حالت میں ایک چادر اوڑھ کر لیٹیں۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا ینظر الرجل الی عورۃ الرجل ولا المرأۃ الی عورۃ المرأۃ ولا یفضی الرجل الی الرجل فی ثوب واحد، ولا تفضی المرأۃ الی المرأۃ فی الثوب الواحد(۲)

"مرد دوسرے مرد کے قابلِ ستر حصے کو نہ دیکھے اور عورت دوسری عورت کے قابلِ ستر حصے کو نہ دیکھے اور مرد دوسرے مرد کے ساتھ (عریاں حالت میں) ایک چادر اوڑھ کر نہ لیٹے اور عورت دوسری عورت کے ساتھ (عریاں حالت میں) ایک چادر اوڑھ کر نہ لیٹے۔"

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے:

"قابلِ ستر حصے کو دیکھنے کی ممانعت اس وجہ سے ہے کہ یہ چیز شہوت کو برانگیختہ کرتی ہے۔ بسا اوقات عورتوں کے درمیان آپس میں شہوانی جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات مردوں کے درمیان بھی آپس میں شہوانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ مرد کو مرد کے ساتھ اور عورت کو عورت کے ساتھ ایک چادر اوڑھ کر لیٹنے سے اس وجہ سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ اس سے شہوت اور جنسی خواہش کے برانگیختہ

---

(۱) جامع ترمذی، کتاب الرضاع، ۱۱۶۵

(۲) صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب تحریم النظر الی العورات، ۷۹۴

ہونے کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اس سے اندیشہ ہے کہ سحاق (عورت کا عورت سے شہوانی تعلق) اور لواطت (مرد کا مرد سے شہوانی تعلق) کی طرف میلان ہو جائے۔"(۱)

فقہاء کا نقطۂ نظر

جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ عملِ قومِ لوط کی وہی سزا ہے جو زنا کی ہے۔ شادی شدہ شخص کو رجم کیا جائے گا اور غیر شادی شدہ کو کوڑے لگائے جائیں گے۔ اس لیے کہ قرآن کریم میں زنا کو بھی فاحشہ کہا گیا ہے (بنی اسرائیل: ۳۲) اور عملِ قومِ لوط کو بھی (الاعراف: ۸۰)۔ البتہ اس کی تفصیلات میں ان کے درمیان اختلاف ہے:

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی تعزیر کی جائے گی۔ صاحبین (قاضی ابو یوسف اور امام محمد) فرماتے ہیں کہ اسے زنا کی سزا دی جائے گی، البتہ اگر وہ بار بار اس فعلِ بد کا ارتکاب کرے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ اس فعل کا مرتکب چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اسے رجم کیا جائے گا۔ شوافع کے نزدیک ایسے شخص پر حدِ زنا جاری کی جائے گی۔ ایک قول یہ ہے کہ ایسا شخص چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ امام احمدؒ کے نزدیک بھی اس پر حدِ زنا جاری ہوگی۔

یہی حکم سحاق کا بھی ہے۔ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورتوں کا ایک دوسرے سے شہوانی لذت حاصل کرنا حرام ہے، البتہ ایسا کرنے والی عورتوں پر حد نہیں جاری ہوگی، بلکہ ان کی تعزیر ہوگی۔(۲)

متمدن سماج کی ذمہ داری

گزشتہ تفصیل سے واضح ہوا کہ ہم جنسیت کسی بھی سماج کے لیے سمِ قاتل ہے۔ یہ انسانی فطرت سے بغاوت اور اس کے خلاف جنگ ہے۔ جو لوگ اس گھناؤنے فعل میں مبتلا

---

(۱) شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/ ۱۹۳

(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ، کویت: ۲۴/ ۲۵۱۔۲۵۲، ۳۵/ ۳۴۰۔۳۴۱

رہتے ہیں، صرف وہی مہلک اور لاعلاج امراض کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ اس سے صحتِ عامہ کے سنگین مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مزید برآں اس سے خاندان کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں اور تمدن کا شیرازہ منتشر ہونے لگتا ہے۔ اس لیے سماج کے سوچنے سمجھنے والے اور سنجیدہ افراد کی ذمہ داری ہے کہ اس سیلِ رواں پر بند باندھنے کی کوشش کریں۔ فرد کی ذاتی آزادی، مساوات اور عدمِ تفریق کے بنیادی حقوق کی دہائی دے کر اسے قانونی جواز نہیں فراہم کیا جا سکتا۔ یہ سرمایہ دارانہ استعمار کی منصوبہ بند سازش ہے، جسے سماج کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے ناکام بنانا ضروری ہے۔

☆☆☆

مصنوعی طریقہ ہائے تولید

بیسویں صدی عیسوی میں سائنس اور ٹکنالوجی کے تمام میدانوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ نت نئی اکتشافات وایجادات نے انسانی زندگی کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس دور میں جہاں ایک طرف ایٹمی اور نیوکلیائی مہلک ہتھیاروں کی ایجادات نے انسانیت کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے اور انسانی خون کو انتہائی ارزاں بنا دیا ہے، وہیں دوسری طرف بے شمار مفید ایجادات نے انسانی زندگی کے لیے بیش بہا سہولتیں پیدا کر دی ہیں اور پوری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں کے مثل ہو گئی ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی یہ محیر العقول کامیابیاں مغرب میں ہوئی ہیں۔ مغرب نے یہ ترقی اپنی مذہب بے زاری کے نتیجے میں اخلاق واقدار کی پابندیوں سے آزاد ہو کر حاصل کی ہے۔ چناں چہ بعض ایجادات کے نتیجے میں انسانی اور اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہوئی ہیں اور بہت سے مسائل کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ خود مغرب میں ایک طبقہ ان بے اعتدالیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگا ہے۔

اسلام اپنا ایک نظامِ فکر وعمل رکھتا ہے۔ اس لیے مغرب کی تمام ایجادات واکتشافات اس کے نزدیک من وعن قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں، بلکہ دیکھنا ہوگا کہ ان میں سے کون کون سی چیزیں اس کی قدروں اور روحِ شریعت سے ہم آہنگ ہیں اور کون کون سی چیزیں اس کی بنیادی تعلیمات اور احکام سے ٹکراتی ہیں۔

تولیدی حیاتیات

سائنسی ایجادات کا ایک بہت بڑا میدان تولیدی حیاتیات (Reproductive Biology) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میدان میں مغرب نے بہت ترقی کی ہے اور حیرت انگیز ایجادات ہوگئی ہیں۔ مثلاً منعِ حمل کے لیے کنڈومس، جیلیز، فومس، پلس، کریم، نس بندی، کرہ بندی اور دیگر طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں۔ اندرونِ رحم جنین کی جنس یا خلقی بدہیئتی کا پتہ لگانے والے آلات کی ایجاد کے بعد اسقاطِ حمل میں اضافہ ہوگیا ہے۔ جنسی اعضاء میں کسی نقص کی بنا پر طبعی تولید میں رکاوٹ کو مختلف طریقوں اور تدابیر سے دور کر لیا گیا ہے۔ مغرب میں ان تمام انکشافات سے بلا روک ٹوک فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ لیکن کیا یہ تمام طریقے اسلام کے نزدیک بھی قابلِ قبول ہیں؟ معاصر علماء نے ان مسائل پر غور و خوض کیا ہے اور اسلامی شریعت کی روح اور نصوص کو سامنے رکھ کر انہیں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔(۱) آئندہ سطور میں مغرب میں ایجاد ہونے والے مصنوعی طریقہ ہائے تولید کا اسلام کی روشنی میں جائزہ لینا مقصود ہے۔

فطری طریقۂ تولید

انسان کی تخلیق مرد اور عورت کے جنسی اتصال (Sexual Contact) سے ہوتی ہے۔ اس میں دونوں کے نطفے شامل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:(۲)

---

(۱) جدید مسائل کو حل کرنے میں علماء نے انفرادی سطح پر بھی کوشش کی ہے اور اجتماعی سطح پر بھی۔ اجتماعی کوششوں میں مجمع الفقہ الاسلامی الدولی جدہ، مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ اور اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی کی خدمات لائقِ ستائش ہیں۔ ان اکیڈمیوں کے سیمناروں میں خاندانی منصوبہ بندی، مصنوعی بار آوری، ٹیسٹ ٹیوب بے بی، طبی اخلاقیات، اعضاء کی پیوندکاری، کلوننگ، ضرورت سے زائد تلقیح شدہ بیضات، علاج میں حرج کو ملحوظ رکھنے کے ضوابط جیسے موضوعات پر بحثیں ہوچکی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے سہ ماہی فکرِ اسلامی بستی کی اشاعت خاص 'معاصر فقہ اسلامی نمبر' جولائی ۱۹۹۹ء تا جون ۲۰۰۰ء میں مذکورہ اکیڈمیوں کا تعارف۔

(۲) قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے چودہ سو سال قبل یہ انکشاف کیا تھا کہ انسان کی تخلیق مرد اور عورت دونوں کے نطفوں سے مل کر ہوتی ہے۔ حالاں کہ ماضی قریب تک سائنس داں یہی سمجھتے رہے تھے کہ تخلیقِ انسانی کا اصل ذمہ دار عورت کا بیضہ ہوتا ہے (موریس بوکائی، بائبل، قرآن اور سائنس، ص: ۳۳۳)

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ﴾ (الدہر: ۲)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا ہے۔"

ایک مرتبہ خارج ہونے والے مرد کے نطفے میں کروڑوں حیوانات منویہ موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں صرف ایک کا اتصال عورت کے بیضہ سے ہو پاتا ہے۔ عورت کے خصیۃ الرحم (Ovaries) میں تقریباً پانچ لاکھ غیر پختہ بیضے ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سے صرف چار سو پوری عمر میں پختہ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہر ماہ خصیۃ الرحم کے حوصلہ یعنی کیسۂ بیضہ (Graafian follicle) سے ایک یا ایک سے زائد بیضہ کا اخراج (Ovulation) ہوتا ہے۔ قاذفین (Fallopian tubes) کے سروں پر کچھ زوائد (Fimbriae) ہوتے ہیں جن کی وجہ سے خارج شدہ بیضہ قاذف میں آ جاتا ہے اور اس کے باہری تہائی حصہ میں مرد کے نطفہ اور بیضہ کا اتصال و امتزاج ہوتا ہے اور عمل بار آوری (Fertilization) انجام پاتا ہے۔ یہ بار آور بیضہ بہت سے خلیوں میں تقسیم ہوتا ہے اور مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد قاذف سے اتر کر رحم میں داخل ہو جاتا ہے اور بار آوری کے چھٹے دن مستبطن الرحم (Endometrium) میں چپک جاتا ہے۔ پھر نشوونما پاتے ہوئے جنین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔(۱)

فطری طریقۂ تولید میں نقائص

جنسی اعضاء میں سے کسی عضو میں کوئی نقص ہو تو بار آوری اور تولید کا عمل انجام نہیں پا سکتا۔ یہ نقص مرد میں بھی ہو سکتا ہے اور عورت میں بھی۔ مرد میں نقص کے مختلف اسباب ہیں:

۱۔ قوت مردی میں کمی کی وجہ سے وہ مجامعت پر قادر نہ ہو۔

۲۔ مادۂ تولید میں حیوانات منویہ کا تناسب کم اور ان کی حرکت کمزور ہو۔

۳۔ مادۂ تولید کو خصیوں سے عضو تناسل تک لانے والی رگیں مسدود ہو گئی ہوں۔

۴۔ خصیے بے کار ہوں یا اوپر چڑھے ہوئے ہوں۔

---

(۱) محمد رضی الاسلام ندوی، تخلیق انسانی کے مراحل اور قرآن کا سائنسی اعجاز، ص: ۲۳-۲۵

اسی طرح عورت میں نقص کی بھی متعدد صورتیں ہیں:

۱۔ خصیۃ الرحم میں کسی نقص کے سبب اس سے بیضہ کا اخراج ممکن نہ ہو۔

۲۔ قاذفین پیدائشی طور پر موجود نہ ہوں یا وہ مسدود ہو گئے ہوں۔

۳۔ عورت پیدائشی طور پر رحم سے محروم ہو یا کسی مرض کے سبب اس میں بار آور بیضہ کا استقرار ممکن نہ ہو۔

مصنوعی طریقہ ہائے تولید سے استفادہ؟

علاج معالجہ اور تولیدی ٹکنالوجی میں غیر معمولی ترقی کے سبب بہت سے امراض و نقائص کا علاج ممکن ہو گیا ہے اور تولید کے بہت سے مصنوعی طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ یہ طریقے اسلامی اقدار سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں اور کس کس مقام پر متصادم ہیں؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مصنوعی طریقوں کو بروئے کار لانا کہیں 'سنۃ اللہ' میں مداخلت تو نہیں ہے؟ انسانوں کی تخلیق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ اِنَاثًا
وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ
مَنْ يَّشَاۗءُ عَقِيْمًا ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (الشوریٰ: ۴۹-۵۰)

"اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مرد یا عورت کا طبعی طور پر تولیدی صلاحیت سے محروم رہنا تقدیر الٰہی پر مبنی ہے۔ پھر کیا اس تقدیر پر راضی برضا نہ رہنا اور تولید کے لیے مصنوعی طریقے اختیار کرنا اس پر ایمان کے منافی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بانجھ پن ایک مرض ہے اور جائز حدود میں رہتے ہوئے ازالہ مرض کی تدابیر اختیار کرنا نہ صرف جائز، بلکہ واجب ہے۔ ایک

حدیث میں حضرت اسامہ بن شریک فرماتے ہیں کہ کچھ بدوؤں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ اگر ہم بیمار ہوں تو کیا علاج کروانا چاہیے؟ آں حضرت ﷺ نے جواب دیا:

> نعم. یا عباد اللہ تداووا فان اللہ لم یضع داءً الا وضع لہ دواءً(۱)

"ہاں، اے اللہ کے بندو، علاج کرو، اس لیے کہ اللہ نے ہر مرض کا علاج رکھا ہے۔"

ایک دوسری حدیث حضرت ابی خزامہ سے مروی ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: اللہ نے تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا ہے، کیا علاج معالجہ سے وہ بدل سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ھی من قدر اللہ، یعنی علاج معالجہ کرنا بھی اللہ کی تقدیر سے ہے۔(۲)

اولاد کی خواہش انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ... (آل عمران: ۱۴) (لوگوں کے لیے مرغوبات نفس: عورتیں، اولاد..... بڑی خوش آیند بنا دی گئی ہیں) اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہیں۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الکہف: ۴۶) بندوں پر اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے انھیں اولاد سے نوازا ہے: وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ (بنی اسرائیل ۶) (اور ہم نے تمھیں مال اور اولاد سے مدد دی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد حاصل کرنے کی خواہش انسان کی فطری خواہش ہے اور اس کی تکمیل کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ ہو تو اسے دور کرنے کے لیے شرعی حدود میں مصنوعی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔

مصنوعی طریقہ ہائے تولید درج ذیل ہیں:

مصنوعی بار آوری (Artificial Inscmination)

اس طریقہ میں مرد کا نطفہ ایک ایسی سرنج میں لیا جاتا ہے جو ایک پتلے ٹیوب

---

(۱) جامع ترمذی، ابواب الطب، باب ما جاء فی الدواء والحث علیہ ۲۰۳۸، سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی الرجل یتداوی، ۳۸۵۵، سنن ابن ماجہ، ابواب الطب، باب ما انزل اللہ داء الا انزل لہ شفاء، ۳۴۳۶

(۲) سنن ابن ماجہ حوالہ سابق

(Catheter) سے منسلک ہوتی ہے۔ یہ ٹیوب پوری احتیاط کے ساتھ قناۃ عنق الرحم (Cervical Canal) میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح نطفہ کو آہستگی کے ساتھ رحم میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں عورت کا بیضہ اس سے مل کر بارآور ہوتا ہے۔ یہ طریقہ اس صورت میں اختیار کیا جاتا ہے جب مرد قوت مردی میں کمی کے باعث مجامعت پر قادر نہ ہو، لیکن اس کا مادۂ تولید حیاتیاتی اعتبار سے صحت مند ہو اور اس میں تولیدی صلاحیت موجود ہو۔ مادۂ تولید جلق (Masturbation) کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس تکنیک کا اولین کامیاب تجربہ ۱۹۷۰ء میں کیا گیا، جب دو لاکھ امریکی عورتیں اس طریقہ سے حاملہ کی گئیں۔(۱)

ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری

مصنوعی تولید کا ایک دوسرا طریقہ ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری (In Vitro Fertilization) ہے۔ اس کی ضرورت اس صورت میں پڑتی ہے جب عورت میں قاذفین سرے سے موجود نہ ہوں یا کسی وجہ سے مسدود ہو گئے ہوں۔ اس بنا پر مرد کے نطفہ سے عورت کے بیضہ کا اتصال اور بارآوری، پھر رحم میں اس کی تنصیب نہیں ہو پاتی۔ اس طریقہ میں عورت کا بیضہ اور مرد کا نطفہ حاصل کرکے دونوں کو ایک ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کیا جاتا ہے، پھر ایک متعین مدت کے بعد اس بارآور بیضہ کو عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

عورت کا بیضہ حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے بیضوں کو پختہ کرنے کے لیے عورت کو تولیدی ہارمون (Reproductive Hormone) دیے جاتے ہیں۔ پھر زیر ناف ایک چھوٹا سا شگاف دے کر Laparoscope نامی ایک آلہ اندر داخل کرکے خصیۃ الرحم کا معاینہ کیا جاتا ہے۔ جب پختہ بیضے خصیۃ الرحم کے حویصلے (Ovarian Follicle) سے نکلنے کے قریب ہوتے ہیں تو ان کی دیواروں میں سوراخ کرکے ایک بادکش آلہ (Vacuum Aspirator) کے ذریعہ بیضوں کو نکال لیا جاتا ہے، پھر انہیں ایک غذائی محلول (Nutrient

---

(۱) منور احمد انیس، مقالہ 'تولیدی حیاتیات'، سہ ماہی تحقیقی مجلہ آیات علی گڑھ، جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری۔ اپریل ۱۹۹۰ء، ص: ۱۲۳

(Solution) میں منتقل کرکے اسی میں مرد کے نطفہ کو شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس بارآور بیضہ کو ایک دوسرے غذائی محلول میں منتقل کر دیا جاتا ہے، جہاں خلیوں میں اس کی تقسیم کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ادھر عورت کو ہارمون کے انجکشن دیے جاتے ہیں، تاکہ اس کا رحم بارآور بیضہ کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔ آخر میں اس بارآور بیضہ کو پلاسٹک ٹیوب (Cannula) کے ذریعہ عنق رحم (Cervix) کی راہ سے رحم میں پہنچا دیا جاتا ہے، جہاں وہ رحم کی دیوار میں نصب ہو جاتا ہے اور معمول کے مطابق جنین کی نشوونما ہونے لگتی ہے۔(۱)

تولید کے مذکورہ بالا دونوں مصنوعی طریقوں کو اختیار کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بارآوری شوہر کے نطفہ سے ہو اور دوسرے یہ کہ کسی غیر مرد کے نطفے سے ہو۔ دونوں کی الگ الگ وضاحت کی جاتی ہے:

(الف) شوہر کے نطفہ سے بارآوری

اگر مذکورہ بالا دونوں طریقوں میں بارآوری کا عمل شوہر کے نطفہ سے انجام پا رہا ہو تو کیا اسلامی شریعت کی رو سے انھیں اختیار کیا جا سکتا ہے؟ شریعت میں بہ ظاہر کوئی ایسا حکم نہیں ہے جس سے یہ عمل ممنوع قرار پاتا ہو۔ اسلام نے نکاح کو مرد و عورت کے درمیان اختلاط کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد ان کے نطفوں کی آمیزش سے تولید کی مصنوعی کوشش میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان طریقوں کی انجام دہی میں اگرچہ بعض ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جو عام حالات میں ناجائز ہیں، مثلاً جلق کے ذریعہ نطفہ کا اخراج اور بے ستری وغیرہ، لیکن استقرارِ حمل کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہ ہو اور اولاد کی خواہش ہو تو ضرورۃً اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

اصولی طور پر فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں، لیکن بعض فقہاء اس کے ساتھ کچھ ایسی شرائط عائد کر دیتے ہیں کہ اجازت حرمت میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً مولانا برہان الدین سنبھلی فرماتے ہیں:

---

(۱) ابو الفضل محسن ابراہیم، جدید حیاتیاتی مسائل اور اسلام، ص: ۹۵-۹۶ (باختصار)

"اگر زوجین کے علاوہ کسی اور کے سامنے دونوں یا ان میں سے کسی ایک کی بھی شرم گاہ نہ کھلے اور مادہ کے اخراج نیز رحم میں اسے داخل کرنے کا ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا اگر ممکن ہو کہ جس میں شرعی قباحتیں نہ ہوں تو اصولاً یہ عمل حرام نہ ہوگا۔" (۱)

آگے فرماتے ہیں:

"اگر شوہر عزل کے طریقے سے اپنا مادہ اکٹھا کرے اور پھر خود ہی کسی نلکی (یا انجکشن سے) اپنی بیوی کے رحم میں داخل کر دے تو یہ عمل جائز ہوگی۔۔۔۔ مگر جماع پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں عزل کے طریقے سے مادہ تولید کا اخراج ممکن نہ ہو تو کیا جلق کے طریقے سے اخراج کی اجازت ہوگی؟ احقر کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے، کیوں کہ محض اولاد کی خواہش اور اس کی موہوم امید میں متفق علیہ طور پر ممنوع فعل کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" (۲)

پھر اس پر حاشیہ لگاتے ہیں:

"لیکن اگر اس کے ذریعہ بچہ کے پیدا ہونے کا قوی امکان ہو تو جائز ہوگا اور جلق کی ممانعت کی وجہ (ضیاع نطفہ) مرتفع ہو جائے گی۔ کیوں کہ یہاں نطفہ کا ضیاع نہیں، بلکہ اسے کارآمد بنایا گیا ہے۔ اس غرض کے لیے جلق ممنوع نہ ہوگا۔" (۳)

آخر میں فرماتے ہیں:

"شوہر کے مادہ کا بیوی کے مادہ سے ملاپ اگر اس طور پر ہو کہ دونوں میں سے کسی کو بھی کسی اور کے سامنے ننگا نہ ہونا پڑتا ہو (نیز اس کے علاوہ بھی کوئی اور خلاف شرع کام نہ کرنا پڑتا ہو) تو یہ عمل ناجائز نہ ہوگا۔" (۴)

اس کے مقابلے میں بعض فقہاء اس طرح کی کوئی قید نہیں لگاتے ہیں مثلاً مولانا

---

(۱) مولانا برہان الدین سنبھلی، موجودہ زمانے کے مسائل کا شرعی حل، ص: ۱۸۳

(۲) حوالہ سابق، ص: ۱۸۳۔۱۸۴

(۳) حوالہ سابق، ص: ۱۸۴

(۴) حوالہ سابق، ص: ۱۸۵

خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں:

> "مگر ان صورتوں میں شوہر کے لیے جلق، عورت کے لیے دایہ کے سامنے بے ستری اور ایک گونہ استقرار حمل کے لیے غیر فطری طریق کے استعمال کی نوبت آتی ہے، لیکن اگر طبی اعتبار سے عورت استقرار حمل کی صلاحیت تو رکھتی ہو اور حصول اولاد کا شدید داعیہ ہو تو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ یہ ایک طریقۂ علاج ہے اور شریعت میں علاج کے باب میں ان امور میں نرمی دی کی گنجائش موجود ہے۔" (۱)

(ب) غیر مرد کے نطفہ سے بار آوری

اگر شوہر مکمل نامرد ہو، یا اس کا نطفہ انجاب و تولید کی صلاحیت سے محروم ہو تو عورت کو بارآور کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص کا نطفہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مغرب میں اس طریقہ کا تیزی سے رواج ہو رہا ہے اور اس کے لیے مادۂ تولید کے بینک (Sperm Banks) قائم کیے گئے ہیں۔ جی۔ بے اپناس (۱۹۷۹ء) لکھتی ہیں:

> "امریکہ میں دو ایسے کمرشیل اسپرم بینک ہیں جو ہر ماہ دو سو سے زائد فرمائشوں کی تعمیل کرتے ہیں۔" (۲)

وہ مزید لکھتی ہیں:

> "مغرب میں سالانہ چھ ہزار سے دس ہزار افراد کے لیے نطفۂ مصنوعی کے ذریعہ مصنوعی تخم ریزی ہوتی ہے۔ تولیدی نقائص کے حامل شوہروں اور غیر شادی شدہ عورتوں، دونوں میں اس طریقہ کا استعمال بڑھ رہا ہے۔" (۳)

مغرب میں اسپرم بینک کا تصور کس طرح رواج پا رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں اسکینڈیڈو، کیلی فورنیا میں ایک مرکز Repository for Germinal Choice کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ یعنی عمدہ نطفہ کا مخزن۔ اس مرکز کا دعویٰ

---

(۱) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، حلال و حرام، دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد، ۱۹۹۳ء، طبع دوم ص: ۳۰۳

(۲) بحوالہ منور انیس، ص: ۱۳۳

(۳) حوالہ سابق ص: ۱۳۵

تھا کہ وہ نوبل انعام یافتہ افراد سے ان کے نطفے حاصل کرکے انھیں محفوظ کرتا اور اعلیٰ ذہانت کی حامل عورتوں کو مصنوعی بار آوری کے لیے پیش کرتا ہے جن کے شوہر تولیدی صلاحیتوں سے محروم ہوں۔ ۱۹۹۹ء میں یہ مرکز اس کی بانی کی وفات کے بعد بند ہو گیا۔(۱)

مصنوعی بار آوری کا یہ طریقہ اسلامی شریعت کی رو سے قطعاً ناجائز ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے نسب میں اختلاط ہوتا ہے۔ ایک عورت کی بار آوری کسی ایسے شخص کے نطفے سے جو اس سے باقاعدہ رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہو، اس کے نزدیک حرام اور زنا کے مترادف ہے۔

حضرت رویفع بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لا يحل لامرئ يؤمن بالله واليوم الآخر أن يسقي ماءه زرع غيره(۲)

''کسی شخص کے لیے، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو، جائز نہیں ہے کہ اپنے مادۂ تولید سے کسی دوسرے کے کھیت (یعنی غیر عورت) کو سیراب کرے۔''

اسی بنا پر فقہاء نے بھی اس کی حرمت کی صراحت کی ہے۔ ڈاکٹر یوسف القرضاوی فرماتے ہیں:

> ''اسلام نے نسب کے تحفظ کا سامان کرکے اور متبنیت کو حرام قرار دے کر خاندان کو غلط عناصر سے پاک رکھنا چاہا ہے۔ اس کے پیش نظر حمل ٹھہروانے کا مصنوعی طریقہ حرام قرار پاتا ہے، جب کہ حمل شوہر کے نطفے کے علاوہ کسی اور تعلق سے ٹھہرایا جائے۔'' (۳)

مولانا برہان الدین سنبھلی نے لکھا ہے:

> ''شوہر کے علاوہ کسی اور کا مادہ منویہ ملانا یا اجنبی عورت کے رحم میں پہنچانا قطعاً حرام ہے، خواہ یہ براہ راست رحم کے اندر پہلے ہی مرحلے میں پہنچا دیا جائے یا ٹیسٹ ٹیوب میں دونوں کا مادہ اکٹھا کرکے اور نشو و نما دے کر پہنچایا جائے، دونوں ہی شکلیں حرام ہیں۔'' (۴)

---

(۱) بحوالہ منور انیس، ص: ۱۲۳

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی وطی السبایا، ۲۱۵۸، مسند احمد: ۴/۱۰۸

(۳) ڈاکٹر یوسف القرضاوی، اسلام میں حلال و حرام، ص: ۲۹۹-۳۰۰

(۴) موجودہ زمانے کے مسائل کا شرعی حل، ص: ۱۸۰-۱۸۱

اسپرم بینک میں شوہر کا نطفہ

مغرب میں مادۂ تولید کو طویل عرصہ تک محفوظ رکھنے کے لیے بڑے بڑے مراکز (Sperm Banks) قائم ہو گئے ہیں۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی شخص کے مادۂ تولید کو، جو بینک میں جمع ہو، اس کی وفات کے بعد اس کی بیوی کو حاملہ کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اسلامی شریعت کی رو سے یہ ناجائز ہوگا، کیوں کہ موت اس معنی میں رشتۂ ازدواج کو کالعدم کر دیتی ہے کہ عورت عدت پوری ہونے کے بعد کسی مرد سے نکاح کر سکتی ہے، لہٰذا شوہر کی موت کے بعد اس کے محفوظ نطفے سے اس کی بیوی کو حاملہ کرنا بھی ایک ناجائز فعل ہوگا۔(۱)

انتقالِ بیضہ

ایک صورت یہ ہے کہ کسی نقص کے سبب عورت کے خصیۃ الرحم سے بیضہ خارج نہیں ہو پاتا، لیکن اس کا رحم بالکل ٹھیک اور استقرارِ حمل کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس صورت میں ایک دوسری عورت کا بیضہ بیوی کے رحم میں منتقل کیا جاتا ہے، یا شوہر کے مادۂ تولید سے دوسری عورت کا بیضہ اس کے رحم میں بارآور کر کے یا دونوں کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کر کے اس بارآور بیضہ کی تنصیب بیوی کی رحم میں کر دی جاتی ہے۔

اسلامی شریعت کی رو سے اس کے جواز کی بھی کوئی صورت نہیں ہے، اس لیے کہ ایسے مرد و عورت، جن کے درمیان رشتۂ ازدواج نہ ہو، ان کے مادوں کا کسی صورت میں اختلاط جائز نہیں ہے۔

قائم مقام مادریت

مغرب میں اولاد حاصل کرنے کے لیے ایک طریقہ بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے جسے قائم مقام مادریت (Surrogacy) کہتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

---

(۱) جدید حیاتیاتی مسائل اور اسلام، ص: ۹۳

ایک یہ کہ شوہر نطفہ اور بیوی بیضہ فراہم کر سکتی ہو، لیکن بیوی رحم کے کسی مرض کی وجہ سے حاملہ نہ ہو سکتی ہو، یا ہونا نہ چاہتی ہو۔ لہٰذا زوجین کسی دوسری عورت کے رحم کو کرائے پر لے لیتے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب میں دونوں کے مادوں کا ملاپ کر کے حاصل شدہ جنین کو اس عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور ولادت کے بعد اس بچے کو زوجین کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بیوی سے بیضہ بھی حاصل نہ ہو سکتا ہو۔ اس صورت میں شادی شدہ جوڑا اولاد کے لیے کسی دوسری عورت کی خدمات حاصل کرتا ہے، تاکہ شوہر کا نطفہ اس کے بیضہ سے مل کر بصورت جنین اس کے رحم میں پرورش پائے۔(۱)

قائم مقام مادریت کی صورت میں بچے کی دو مائیں ہو جاتی ہیں: ایک قانونی ماں، جو اسے حاصل کرنے کے لیے دوسری عورت سے معاہدہ کرتی ہے اور دوسری حیاتیاتی ماں، جو اپنے رحم میں اس کی پرورش کرتی ہے اور یہ کام رضاکارانہ طور پر یا کچھ مال کے عوض انجام دیتی ہے۔ امریکہ میں اس معاہدہ کے تحت قائم مقام ماں دس ہزار ڈالر تک معاوضہ لیتی ہے۔(۲)

یہ طریقہ مغرب میں کافی رواج پا رہا ہے۔ امریکہ کی کچھ ریاستوں میں اس کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ جنوبی افریقہ کے قصبہ زانین کی پات انتونی نامی ایک عورت نے اپنی حقیقی بیٹی کیرین کے جنین کو عمل تنصیب کے ذریعہ اپنے رحم میں لیا اور معمول کی مدت پوری کر کے اسے جنم دیا۔(۳)

اسلامی شریعت کی رو سے یہ طریقہ ناقابل قبول اور زنا کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک استقرار حمل نکاح کے نتیجہ میں ہونا چاہیے۔ اسلام کسی ایسے تصور مادریت کی توثیق نہیں کرتا جو دو الگ الگ حیاتیاتی اور قانونی حصوں میں تقسیم ہو۔ اس کی نظر میں ایک ہی ماں حیاتیاتی اور قانونی دونوں حیثیتوں کا مظہر ہوتی ہے۔

---

(۱) ماہر۔ ایم۔ اشفاق، مقالہ 'قائم مقام مادریت اور اسلام'، سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جلد ۵، شمارہ ۱، جنوری۔ اپریل ۱۹۹۴ء، ص: ۳۲

(۲) جدید حیاتیاتی مسائل اور اسلام، ص: ۱۰۴

(۳) حوالہ سابق، ص: ۱۰۴

قائم مقام مادریت کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کی دو بیویاں ہوں۔ ایک بیوی کا بیضہ لے کر شوہر کے نطفہ سے اسے بارآور کر کے اس کی پرورش دوسری بیوی کے رحم میں کی جائے۔ کیا اسلامی شریعت اس کی اجازت دیتی ہے؟ فقہاء اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔

مولانا برہان الدین سنبھلی فرماتے ہیں:

> ”بیضہ جس عورت سے لیا گیا اگر وہ بھی بیوی ہو اس مرد کی جس کے نطفہ سے مخلوط کیا گیا ہے اور پھر یہ مرکب جس عورت کے جسم میں داخل کیا گیا ہے وہ بھی اس مرد کی بیوی ہو تو جواز کا امکان ہے ورنہ نہیں۔“ (۱)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے جواز کی جو صورتیں بتائی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

> ”شوہر اور اس کی ایک بیوی کا مادہ حاصل کیا جائے اور اس کے آمیزے کو اسی شوہر کی دوسری بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جائے۔ اس لیے کہ اس کی پہلی بیوی زچگی کی متحمل نہ ہو یا طبی اسباب کی بنا پر تولید کی اہل نہ ہو۔“ (۲)

اس صورت میں اس بچے کی ماں کون ہوگی؟ بیضہ دینے والی یا رحم میں پرورش کرنے والی؟ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ دونوں کو ماں قرار دیا جائے۔ فرماتے ہیں:

> ”اگر مرد کی ایک بیوی کا بیضۃ المنی حاصل کیا گیا اور دوسرے کے رحم میں پرورش و پرداخت ہوئی اور اس نے ولادت کی تکلیف برداشت کی تو ظاہر ہے کہ یہ دوسری عورت اس کی ماں ہوگی، اس لیے کہ بچہ جننے والی ہی کو ماں قرار دیا جاتا ہے، لیکن چوں کہ اس پہلی عورت کا بیضۃ المنی بھی اس کی تکوین کے لیے اصل اور اساس بنا ہے اس لیے اس کو بھی ماں قرار دیا جانا چاہیے۔ فقہاء کے یہاں بعض صورتوں میں ایک

---

(۱) موجودہ زمانے کے مسائل کا شرعی حل، ص: ۸۲

(۲) حلال و حرام، ص: ۳۰۳

نظیریں موجود ہیں کہ ایک بچہ کا نسب دو اشخاص سے ثابت کیا جائے۔" (۱)

لیکن مولانا برہان الدین سنبھلی اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ماں صرف وہ عورت سمجھی جائے گی جس کے بطن سے بچے کی پیدائش ہوئی ہو۔ فرماتے ہیں:

> "وہی عورت اس بچے کی شرعاً ماں سمجھی جائے گی جس کے بطن میں بچہ کی پرورش ہوئی اور پھر اسی سے ولادت ہوئی۔ إِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ کے تقاضے سے۔ اس سلسلہ میں اگر کسی عورت کے بیضہ سے مدد لی گئی لیکن جنین اس کے بطن میں نہیں رہا، تو وہ ماں نہ ہوگی۔ بعض فضلاء نے دونوں کو ماں قرار دینے کا رجحان ظاہر کیا ہے، لیکن شریعت میں 'دو ماں' ہونے کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس لیے یہ قول لائق اعتبار نہیں ہو سکتا۔" (۲)

حاصلِ بحث

خلاصہ یہ کہ اسلامی شریعت کی رو سے صرف شوہر کے نطفہ سے مصنوعی بار آوری جائز ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ٹیسٹ ٹیوب میں شوہر کے نطفے سے بیوی کا بیضہ بار آور کیا جا سکتا ہے۔ مصنوعی تولید کے بقیہ تمام طریقوں کو اسلامی شریعت سے سندِ جواز نہیں مل سکتی، اس لیے کہ ان سے اختلاطِ نسب ہوتا ہے اور نکاح کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اب اگر عورت بیضہ یا رحم سے محروم ہو تو شوہر کو، اور اگر شوہر نامرد ہو تو عورت کو اس سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر دونوں آپس میں اتنا گہرا جذباتی تعلق رکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے کسی کو اختیار نہیں کر سکتے تو کسی رشتہ دار یا یتیم بچے کو اپنی پرورش میں لے کر روحانی مسرت سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

---

(۱) حلال وحرام، ص: ۳۰۳ ـ ۳۰۴

(۲) موجودہ زمانے کے مسائل کا شرعی حل، ص: ۸۳

اسپرم بینک: تصور اور مسائل

عصر حاضر میں میڈیکل سائنس کے میدان میں غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقیات نے سماجی سطح پر بعض ایسے مسائل کھڑے کر دیے ہیں، جن سے نظامِ خاندان بری طرح شکست و ریخت سے دوچار ہے اور اس کے تانے بانے بکھر کر رہ گئے ہیں۔ ان میں حیواناتِ منویہ کی ذخیرہ اندوزی (Sperm Bank)، ان کا عطیہ (Sperm Donation) اور ان کے ذریعے مصنوعی تلقیح (Artificial insemination) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اسپرم بینک سے مراد وہ طبی مراکز ہیں جو عطیہ دہندگان (Donors) کا نطفہ حاصل کرتے ہیں اور مخصوص تکنیک کے ذریعے ان سے حیواناتِ منویہ الگ کر کے اور انھیں منجمد کر کے اپنے یہاں محفوظ کر لیتے ہیں، تا کہ بعد میں کوئی بھی عورت، جو بچہ چاہتی ہے، انھیں وہاں سے حاصل کر کے، ان کے ذریعے مصنوعی طور پر بار آور ہو جائے اور حمل کی مخصوص مدت گزرنے کے بعد بچہ کو جنم دے۔ اسپرم بینک کا آغاز چار دہائیوں قبل مغرب میں ہوا، لیکن اس مختصر عرصے میں پوری دنیا میں اسے قبولِ عام حاصل ہوا ہے اور بیش تر ممالک میں یہ مراکز قائم ہو چکے ہیں۔

فطری طریقۂ تولید اور اس میں نقائص

اسپرم بینک کا وجود فطری طریقۂ تولید میں پائے جانے والے بعض نقائص کے ازالے کے لیے ہوا ہے۔ نسلِ انسانی کے استمرار و تسلسل کے لیے قدرت نے مرد اور عورت کے جنسی اتصال کو ذریعہ بنایا ہے۔ دونوں کے اعضائے تناسل سے سیال مادے نکلتے ہیں۔ مرد کے خصیے

(Testes) میں اربوں حیواناتِ منویہ (Sperm) پائے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ کے انزال (Ejaculation) میں مرد کے عضو سے جو سیال مادہ (نطفہ / Semen) نکلتا ہے، اس میں حیواناتِ منویہ کی تعداد 40 million سے 2.1 billion تک ہوتی ہے۔ عورت کے خصیۃ الرحم (Ovaries) میں تقریباً 2 million کیساتِ بیضہ (Follicles) ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف چار سو پچاس (۴۵۰) ہی پوری عمر میں پختہ بیضے (Mature Eggs) کے اخراج کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہر ماہ خصیۃ الرحم سے ایک بیضہ کا اخراج (Ovulation) ہوتا ہے۔ جنسی تعلق کے نتیجے میں مرد کے حیواناتِ منویہ (Sperm) میں سے ایک کا عورت کے اعضاءِ تناسل میں قاذفین (Fallopian Tubes) میں سے ایک میں اس کے بیضہ (Ovum) سے اتصال و امتزاج ہوتا ہے۔ اس طرح عملِ بار آوری (Fertilization) انجام پاتا ہے۔ یہ بار آور بیضہ بہت سے خلیوں میں تقسیم ہوتا ہوا اور مختلف مراحل سے گزرتا ہوا رحم (Uterus) میں اتر آتا ہے اور بار آوری کے چھٹے دن مستبطن الرحم (Endometrium) میں چپک جاتا ہے، پھر نشوونما پاتے ہوئے جنین (Foetus) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

جنسی اعضاء میں سے کسی عضو میں کوئی نقص ہو تو بار آوری اور تولید کا عمل انجام نہیں پاسکتا۔ یہ نقص عورت میں بھی ہوسکتا ہے اور مرد میں بھی۔ عورت میں نقص کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً خصیۃ الرحم میں کسی نقص کے سبب اس سے بیضہ کا اخراج ممکن نہ ہو، یا قاذفین پیدائشی طور پر موجود نہ ہوں یا مسدود ہو گئے ہوں، یا عورت پیدائشی طور پر رحم سے محروم ہو، یا کسی مرض کے سبب اس میں بار آور بیضہ کا استقرار ممکن نہ ہو۔ مرد میں نقص کی یہ صورتیں ہوسکتی ہیں کہ وہ قوتِ مردمی میں کمی کے سبب جماع پر قادر نہ ہو، یا اس کے نطفہ میں حیواناتِ منویہ کی تعداد کم اور ان کی حرکت کمزور ہو، یا نطفہ کو خصیوں سے عضوِ تناسل تک لانے والی رگیں مسدود ہوں، یا خصیے بے کار ہوں اور ان میں حیواناتِ منویہ کی پیدائش نہ ہو رہی ہو۔

مصنوعی تلقیح کے میدان میں میڈیکل سائنس کی ترقیات

ان نقائص میں سے بعض خلقی ہیں تو بعض اکتسابی (Acquired)۔ ان کے علاج

معالجے کے سلسلے میں مغرب میں میڈیکل سائنس نے غیر معمولی ترقی کی ہے اور ان کے ازالے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی ہیں۔ مثلاً:

- اگر عورت میں قاذفین سرے سے موجود نہ ہوں، یا کسی وجہ سے مسدود ہو گئے ہوں، جس کی بنا پر مرد کے نطفے سے عورت کے بیضے کا اتصال اور بارآوری، پھر رحم میں اس کی تنصیب نہ ہو پا رہی ہو تو عورت کا بیضہ اور مرد کا نطفہ حاصل کر کے دونوں کو ایک ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو 'ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری' (IVF) In Vitro Fertilization کہا جاتا ہے۔ پھر اس بارآور بیضہ کو ایک متعین مدت کے بعد عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔
- اگر کسی نقص کے سبب عورت کے خصیۃ الرحم سے بیضہ خارج نہ ہو پا رہا ہو، لیکن اس کا رحم بالکل ٹھیک اور استقرار حمل کی صلاحیت رکھتا ہو تو کسی دوسری عورت کا بیضہ لے کر اس کے رحم میں منتقل کیا جاتا ہے، یا شوہر کے نطفے سے دوسری عورت کا بیضہ اسی کے رحم میں بارآور کر کے، یا دونوں کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کر کے اس بارآور بیضہ کی تنصیب بیوی کے رحم میں کر دی جاتی ہے۔ اسے 'انتقال بیضہ' (Ovum Implantation) کہا جاتا ہے۔
- اگر مرد نطفہ اور عورت بیضہ فراہم کر سکتی ہے، لیکن عورت رحم کے کسی مرض میں مبتلا ہو جس کی وجہ سے اس میں استقرار حمل نہ ہو سکتا ہو، یا وہ حاملہ نہ ہونا چاہتی ہو تو زوجین کسی دوسری عورت کے رحم کو کرایے پر لیتے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب میں دونوں کے مادوں کا ملاپ کر کے حاصل شدہ جنین کو اس عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور ولادت کے بعد اس بچے کو زوجین کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بیوی سے بیضہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ شادی شدہ جوڑا اولاد کے لیے کسی دوسری عورت کی خدمات حاصل کرتا ہے، تاکہ شوہر کا نطفہ اس کے بیضے سے مل کر بہ صورت جنین اس کے رحم میں پرورش پائے۔ ان دونوں صورتوں کو 'قائم مقام مادریت' (Surrogacy) کا نام دیا گیا ہے۔
- اگر مرد کا نطفہ حیاتیاتی اعتبار سے صحت مند ہو اور اس میں تولیدی صلاحیت موجود ہو، لیکن وہ قوت مردمی میں کمی کے سبب جماع پر قادر نہ ہو، یا اس کے خصیوں سے عضو تناسل تک نطفہ کو لانے والی رگیں مسدود ہو گئی ہوں تو اس کا نطفہ ایک سرنج میں لے کر عورت کے قناۃ عنق الرحم

(Cervical Canal) کے ذریعے رحم میں پہنچا دیا جاتا ہے، جہاں عورت کا بیضہ اس سے مل کر بارآور ہو جاتا ہے۔ اس طریقہ کو ’مصنوعی تلقیح‘ (Artificial Insemination) کہا جاتا ہے۔

- اگر مرد کے نطفہ میں حیوانات منویہ کا تناسب کم اور ان کی حرکت کم زور ہو، یا وہ تولیدی صلاحیت سے بالکل محروم ہو تو عورت کو بارآور کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص کا نطفہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے لے کر عورت کے بیضے کے ساتھ مصنوعی تلقیح کی جاتی ہے، پھر اسے عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اسے ’عطیۂ حیوانِ منوی‘ (Sperm Donation) کہا جاتا ہے۔(۱)

مصنوعی تلقیح اور اسپرم بینک

مصنوعی تلقیح شوہر کے نطفے سے بھی ممکن ہے اور کسی اجنبی مرد کے نطفے سے بھی۔ اجنبی مرد کے نطفے سے مصنوعی تلقیح کا تجربہ پہلی مرتبہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں کیا گیا۔

۱۹۰۹ء میں امریکن جرنل Medical World میں ڈاکٹر ایڈیسن ڈیوس ہارڈ (Addison Davis Hard) کا ایک مراسلہ شائع ہوا، جس میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ پچیس سال قبل ۱۸۸۴ء میں جیفرسن میڈیکل کالج فلاڈلفیا میں پروفیسر ولیم پین کوسٹ (Prof. William Pancoast) نے عطیۂ حیوانِ منوی کے ذریعے مصنوعی تلقیح کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ یہ تجربہ ایک ایسی عورت پر کیا گیا جو ڈاکٹر ولیم کی مریضہ تھی۔ اس کے بارے میں اس کے شوہر نے بتایا کہ شادی کے کافی دن گزر جانے کے باوجود اسے بچہ نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے عورت کے تمام ٹیسٹ کیے، لیکن وہ ہر لحاظ سے نارمل نکلی۔ شوہر کا ٹیسٹ ہوا تو اس کے نطفے میں حیوانات منویہ اتنے کم پائے گئے کہ ان کے ذریعے استقرارِ حمل ناممکن تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے طلبہ کے سامنے یہ کیس رکھا تو ان میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ کلاس کے سب سے اسمارٹ لڑکے کا نطفہ لے کر اس کے ذریعہ عورت کو بارآور کر دیا جائے۔ یہ تجربہ کیا گیا اور جب تک یہ یقین نہیں ہو گیا کہ اس کے ذریعے عورت حاملہ ہو گئی ہے، اس کے شوہر کو کچھ نہیں بتایا گیا۔ جب شوہر کو اس

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: منور احمد انیس، مقالہ: تولیدی حیاتیات، سہ ماہی مجلہ آیات علی گڑھ، جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری۔ مارچ ۱۹۹۰ء، بحوالہ ابو الفضل محسن ابراہیم، جدید حیاتیاتی مسائل اور اسلام

بات کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا، لیکن اس نے درخواست کی کہ عورت کو یہ باتیں ہرگز نہ بتائی جائیں۔

اس واقعہ سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک مغرب میں بھی شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے نطفے سے عورت کا حاملہ ہونا سماج میں قابلِ نفرت سمجھا جاتا تھا۔ یہ صورت حال بیسویں صدی کے وسط تک برقرار رہی۔ قانونی طور پر بھی اس کی اجازت نہیں تھی۔ ۱۹۵۴ء میں امریکا میں Cook Country کی سپریم کورٹ نے ایک کیس میں زوجین کے درمیان اس وجہ سے علیحدگی کروادی کہ بیوی نے شوہر کی اجازت کے بغیر اجنبی مرد کے نطفے سے مصنوعی تلقیح کروائی تھی۔ عدالت نے یہ رولنگ دی کہ مصنوعی تلقیح سے ہونے والا بچہ چوں کہ نکاح کے دائرے سے باہر پیدا ہوا ہے، اس لیے یہ عمل غیر قانونی اور جرم ہے۔ اٹلی میں اسقفِ اعظم نے اسے گناہ قرار دیا اور مشورہ دیا کہ جو شخص اسے انجام دے اسے جیل بھیج دیا جائے۔ ۱۹۶۴ء میں امریکہ کی ایک عدالت نے فیصلہ دیا کہ مصنوعی تلقیح سے بچہ پیدا کرنا غیر قانونی ہے۔ اس لیے کہ اس میں اجنبی شخص کا حیوانِ منوی استعمال کیا جاتا ہے، جس سے عورت رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں ہوتی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس رجحان میں تبدیلی آنے لگی۔ ۱۹۶۴ء میں جارجیا پہلی ایسی امریکی ریاست ٹھہری جہاں مصنوعی تلقیح سے ہونے والی پیدائش کو قانونی حیثیت دی گئی، اس شرط کے ساتھ کہ اس کے لیے شوہر اور بیوی دونوں نے تحریری طور پر اجازت دی ہو۔ ۱۹۷۴ء میں کمشنرس آف یونی فارم اسٹیٹ لاز نے اور ایک سال کے بعد امریکن بار ایسوسی ایشن نے Uniform Parentago Act منظور کیا۔ اس کے مطابق اگر کسی عورت کی کسی اجنبی مرد کے حیوانِ منوی سے مصنوعی تلقیح اس کے شوہر کی اجازت سے ہوتی ہے تو حیوانِ منوی کا عطیہ دینے والے کو قانونی حقوق حاصل نہیں ہوں گے اور شوہر ہی کو اس بچے کا باپ سمجھا جائے گا۔

مصنوعی تلقیح تازہ اسپرم کے ذریعے بھی ممکن ہے اور منجمد اسپرم کو دوبارہ طبعی حالت پر لا کر بھی۔ منجمد اسپرم کے ذریعے مصنوعی تلقیح کا تصور سب سے پہلے اٹلی کے مشہور ڈاکٹر Montegazza نے ۱۸۶۶ء میں پیش کیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ جو شخص میدانِ جنگ میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے جا رہا ہو اسے چاہیے کہ گھر پر اپنا اسپرم منجمد اور محفوظ کرکے جائے،

تاکہ اگر وہ جنگ میں کام آ جائے یا وہاں سے معذور ہو کر واپس لوٹے تو حسب ضرورت اس کا قانونی وارث جنم لے سکے۔ لیکن یہ تصور نصف صدی کے بعد عملی جامہ پہن سکا۔

اسپرم بینک کا آغاز وارتقاء

۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیانی عرصے میں سائنس دانوں نے دیکھا کہ اسپرم منجمد اور محفوظ کیے جانے کے دوران منفی ۳۲۱ ڈگری فارن ہائٹ تک کا درجہ حرارت برداشت کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں امریکی سائنس داں پارکس (A.S.Parkcs) نے دو برطانوی سائنس دانوں کے ساتھ مل کر ایک اہم دریافت کی۔ انھوں نے گلیسرول نامی رقیق محلول تیار کیا، جو اسپرم کو منجمد کرنے کے دوران اسے جراحت سے بچاتا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں امریکن سائنس داں ڈاکٹر جیروم شیرمن (Dr. Jerome K. Sherman) نے اس میں مزید بہتری پیدا کی اور پہلی مرتبہ منجمد اسپرم کے ذریعے عورت کے بیضہ کی بار آوری کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس کا باقاعدہ اعلان دس سال کے بعد ۱۹۶۳ء میں 11th International Congress of Genetics میں کیا گیا۔ اس طرح اسپرم بینک کے امکانات میں دل چسپی لی جانے لگی۔ اس کے تقریباً ایک دہائی کے بعد ۱۹۷۱ء میں پہلا کمرشیل اسپرم بینک Minnesota(Roseville) میں قائم ہوا۔

اسپرم بینک کو Cryobank بھی کہا جاتا ہے۔ Cryo یونانی لفظ Kryos سے نکلا ہے جس کے معنی 'پالا' (Frost) کے ہیں۔ اس بنا پر اسپرم بینک کا اطلاق ان طبی مراکز پر ہوتا ہے جہاں انسانی نطفہ میں پائے جانے والے حیوانات منویہ کو منجمد کر کے محفوظ کیا جاتا ہے، تاکہ آئندہ وقتِ ضرورت دوبارہ انھیں طبعی حالت پر واپس لا کر ان کے ذریعے استقرارِ حمل کروایا جا سکے۔ اسپرم کو کتنی مدت تک منجمد رکھا جا سکتا ہے؟ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ برطانیہ میں اسپرم کے ایک نمونے کو اکیس (۲۱) سال تک منجمد رکھنے کے بعد اس سے استقرارِ حمل کروایا گیا۔

ابتدا میں اسپرم بینکوں کی توجہ زیادہ تر ان مردوں کو سہولت فراہم کرنے پر تھی جن میں بعض عوارض و اسباب سے نامردی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً بعض مرد نس بندی کے ذریعے اپنی تولیدی صلاحیت ختم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کینسر یا بعض دیگر امراض میں سرجری ضروری ہو جاتی

ہے، یا بعض امراض میں کیمیاوی علاج (Chemotherapy) یا تابکاری (Radiation) کے ذریعہ علاج کیا جاتا ہے۔ ان صورتوں میں تولیدی صلاحیت ختم ہو سکتی ہے۔ اسپرم بینکوں کے ذریعے مردوں کو یہ سہولت حاصل ہوئی کہ وہ مذکورہ علاج کرانے سے قبل اپنے اسپرم کے نمونے ان مراکز میں جمع کرادیں، تاکہ بعد میں اگر انھیں اولاد کی خواہش ہو تو ان کے ذریعے اپنے جوڑوں میں مصنوعی تلقیح کروا سکیں۔ لیکن ساتویں دہائی کے آخر میں Wisconsin University میں محققین اور معالجین کے ذریعے ہونے والے ایک سروے کے بعد یہ مرکز توجہ (Pocus) تبدیل ہو گیا۔ اس سروے میں بتایا گیا کہ امریکا میں 3.5 million بانجھ جوڑوں میں سے تقریباً نصف میں بانجھ پن کا سبب مردوں میں تھا اور یہ کہ اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں میں سے خاصی بڑی تعداد اجنبی مردوں کے تازہ نطفے کے ذریعے مصنوعی تلقیح کرتی تھی۔ وہ یہ نطفے میڈیکل اسٹوڈینٹس یا اسپتال کے عملہ سے حاصل کرتے تھے۔ اس سروے کی اشاعت کے بعد مجہول عطیہ دہندگان کے اسپرم کی طلب بڑھ گئی اور اس کی تکمیل اسپرم بینکوں کا ہدف بن گیا۔

ابتدا میں ڈاکٹر منجمد اسپرم کے استعمال کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ استقرار حمل کے سلسلے میں منجمد اسپرم کے مقابلے میں تازہ اسپرم زیادہ کارگر ہے۔ لیکن آٹھویں دہائی کے وسط سے AIDS نامی موذی مرض کے انکشاف کے نتیجے میں منظرنامہ تبدیل ہو گیا۔ Hepatitis, HIV یا دیگر متعدی جنسی بیماریوں (Sexual Transmitted Diseases STD) کے اندیشے کے سبب American Association of Tissue Bank نے اپنے ممبر بینکوں کو تاکید کی کہ وہ تازہ اسپرم کا استعمال نہ کیا کریں۔ ۱۹۸۸ء میں امریکہ میں صحت کی نگہداشت کے اداروں (1)American Fertility Society (2)Food &drugs Administration (3)Centre for disease Control نے بھی تجویز دی کہ مصنوعی تلقیح کے لیے اجنبی مردوں کے صرف منجمد اسپرم استعمال کیے جائیں۔

موجودہ دور میں اسپرم بینکوں کا دائرہ اور طریقہ کار

مغرب میں اسپرم بینکوں سے تین طرح کی خواتین استفادہ کرتی ہیں:

۱۔ وہ شادی شدہ خواتین جن کے شوہر کسی وجہ سے تولیدی صلاحیت سے محروم ہوں۔

۲۔ ہم جنسیت میں مبتلا خواتین (Lesbians)۔

۳۔ وہ خواتین جن کا نکاح نہ ہوا ہو لیکن وہ ماں بننا چاہتی ہوں (Single Parents)۔

ان خواتین کو اختیار رہتا ہے کہ وہ اسپرم بینک سے ایسے مجہول افراد کا اسپرم لیں جنھیں اپنی خاندانی زندگی کا جز نہ بنانا چاہتی ہوں، یا ایسے افراد کا اسپرم حاصل کریں جن سے بعد میں وہ خود یا پیدا ہونے والا بچہ بالغ ہونے کے بعد رابطہ کر سکیں۔

یہ خواتین عموماً اسپرم حاصل کر کے خود اپنے اندر مصنوعی تلقیح کرواتی ہیں اور استقرار حمل کے بعد متعینہ ایام گزرنے پر بچے جنتی ہیں۔ کچھ خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جو حمل کے لیے کسی دوسری عورت کا رحم کرایے پر لیتی ہیں۔ بیضہ بچہ چاہنے والی عورت کا ہوتا ہے اور اسپرم عطیہ دینے والے مرد کا۔ دونوں کو ٹیسٹ ٹیوب میں بار آور کر کے کرایے کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے، جس میں استقرار شدہ جنین کی پرورش ہوتی ہے۔

بعض بینک اسپرم حاصل کرنے والی خواتین کو آئندہ ہونے والے بچے کی جنس کے انتخاب کی بھی سہولت فراہم کرتے ہیں۔ سائنسی طور پر یہ بات معلوم و محقق ہے کہ اسپرم میں Y Chromoseme لڑکے (Male) کی پیدائش کے ذمے دار ہوتے ہیں، جب کہ X Chromosome سے لڑکی (Female) پیدا ہوتی ہے۔ X اور Y کروموزوم کو الگ کرنے کے لیے اسپرم بینک 'طریقۂ سباحت' (Swimup Method) اختیار کرتے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب میں تازہ حاصل کیے گئے اسپرم کے ساتھ Sperm Extender شامل کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نصف گھنٹے کے بعد Y کروموزوم، جو ہلکے ہوتے ہیں، اوپر تیرنے لگتے ہیں، جب کہ X کروموزوم، جو بھاری ہوتے ہیں، نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ اولاً جنس کی تعیین میں یہ طریقہ سو فی صد کامیاب نہیں ہے، ثانیاً بعض ممالک میں قانونی طور سے اس پر پابندی عائد ہے۔

اسپرم بینکوں میں اپنے اسپرم کا عطیہ دینے والے بعض افراد رفاہی جذبے سے ایسا کرتے ہیں، جب کہ بعض اپنے عطیے کا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ نو (۹) ملکوں میں عطیۂ حیوان منوی (Sperm Donation) پر ہونے والے انتیس (۲۹) مطالعات (Studies) کا نتیجہ

یہ سامنے آیا کہ عطیہ دہندہ کو ایک انزال (Fjaculation) پر دس (۱۰) ڈالر سے ستر (۷۰) یورو تک ملتے ہیں۔ نیو یارک میں واقع Cryos International Sperm Bank سے رابطہ رکھنے والے عطیہ دہندگان کے درمیان ہونے والے سروے سے معلوم ہوا کہ عطیہ کے مذکورہ بالا دو ہی مقاصد اہم ہیں۔ اس اسپرم بینک میں عطیہ پر جو معاوضہ طے تھا، ۲۰۰۴ء میں اس میں سو فی صد اضافہ کر دیا گیا، لیکن نہ نئے عطیہ دہندگان نے رجوع کیا، نہ پرانے عطیہ دہندگان کے عطیوں کی تعداد (Frequency) میں اضافہ ہوا۔ ایک سال کے بعد معاوضہ کی سابقہ شرح بحال کر دی گئی، تب بھی دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نہ عطیہ دہندگان کی تعداد کم نہ ہوئی اور ان کی باریوں میں کمی آئی۔

جو افراد اسپرم بینک کو اپنے اسپرم کا عطیہ دیتے ہیں وہ ان بچوں کی کوئی قانونی ذمہ داری نہیں لیتے جو ان کے اسپرم سے پیدا ہوئے ہوں۔ اس سلسلے میں اسپرم بینک اپنے عطیہ دہندگان سے باضابطہ معاہدہ (Agreement) کر لیتے ہیں۔

اسپرم بینک میں بعض شادی شدہ افراد بھی اپنا اسپرم محفوظ کرواتے ہیں، مثلاً وہ فوجی جو محاذِ جنگ پر جا رہے ہوں۔ (خلیجی جنگ میں بہت سے امریکی فوجیوں نے یہ کام کیا)، یا کینسر وغیرہ کے وہ مریض جو اپنا کیمیاوی علاج (Chemotherapy) کروا رہے ہیں۔

اسپرم بینک عطیہ پر ابھارنے کے لیے پبلسٹی کے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کرتے ہیں، خاص طور پر وہ اس کام کے لیے انٹرنیٹ اور Gay & Lesbian Publications کا سہارا لیتے ہیں۔ عموماً اٹھارہ (۱۸) سے پینتالیس (۴۵) سال کے درمیان کی عمر کے افراد کا اسپرم حاصل کیا جاتا ہے۔ جو افراد ان سے رجوع کرتے ہیں ان کا بہت تفصیل سے معاینہ (Checkup) کیا جاتا ہے کہ وہ موروثی امراض (Genetic Diseases)، کروموسوم سے متعلق نقائص (Chromosomal Abnormalities) یا اسپرم کے ذریعے منتقل ہونے والے متعدی امراض (Sexual Transmitted infections) کا شکار تو نہیں ہیں۔ اگر وہ صحت مند ہوں تو ان کے اسپرم کا نمونہ لے کر اس کی بھی خورد بینی حیاتیاتی جانچ (Microbiological test) کی جاتی ہے کہ اس میں متحرک حیوانات منویہ کی تعداد کیا ہے؟

ان میں تولیدی صلاحیت کتنی ہے؟ عملِ انجماد کے دوران وہ زندہ رہ پائیں گے یا نہیں؟ وغیرہ۔ پھر مخصوص تکنیک سے اسے منجمد کرکے چھ ماہ کے لیے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اسے 'وقفۂ قرنطینہ' (Quarantine Period) کہا جاتا ہے۔ یہ وقفہ گزرنے کے بعد عطیہ دہندہ کا دوبارہ ٹیسٹ یہ جاننے کے لیے کیا جاتا ہے کہ اسے کوئی انفیکشن تو نہیں ہے۔ نتیجہ منفی ہونے کی صورت میں اس کے اسپرم کو مصنوعی تلقیح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اسپرم بینک عطیہ دہندگان کے بارے میں مکمل معلومات محفوظ رکھتے ہیں۔ مثلاً نسل، تعلیم، قد، ہیئت، جلد کی رنگت، آنکھوں کا رنگ، بلڈ گروپ وغیرہ۔ ان میں سے کچھ معلومات انٹرنیٹ پر دست یاب ہوتی ہیں اور کچھ ان افراد کو براہ راست دی جاتی ہیں جو اسپرم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بعض خواتین ایک ہی عطیہ دہندہ کے اسپرم سے ایک سے زیادہ بچے پیدا کرنا چاہتی ہیں تو اسپرم بینک اس کی بھی سہولت فراہم کرتے ہیں۔ امریکہ کے شہر اسکینڈیڈو، کیلی فورنیا میں ۱۹۸۰ء میں ایک اسپرم بینک Respository for Germinal Choice کے نام سے قائم ہوا تھا، یعنی عمدہ نطفہ کا مرکز۔ (تقریباً دو دہائیوں کے بعد یہ مرکز اپنے بانی Rubart Graham کی وفات کے بعد بند ہو گیا)۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ نوبل انعام یافتہ افراد سے ان کے نطفے حاصل کرکے انھیں محفوظ کرتا اور اعلیٰ ذہانت کی حامل ایسی خواتین کو، جن کے شوہر تولیدی صلاحیت سے محروم ہوں، مصنوعی تلقیح کے لیے پیش کرتا ہے۔

اسپرم بینک کے صحیح اور منظم طریقے سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے مختلف ممالک میں قواعد وضوابط وضع کیے گئے ہیں۔ مثلاً بعض ممالک میں مجہول عطیہ دہندگان کے اسپرم استعمال کرنے پر پابندی ہے۔ بعض ممالک غیر شادی شدہ عورت کو عطیۂ حیوانِ منوی کے ذریعے مصنوعی تلقیح کی اجازت نہیں دیتے۔ بعض ممالک نے یہ تعداد متعین کر دی ہے کہ اسپرم کے ایک عطیہ سے زیادہ سے زیادہ کتنے بچے پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے خواست گاران اپنی مطلب براری کے لیے دیگر ممالک کا سفر کرتے ہیں، جہاں اس کی اجازت ہے۔ اسے 'تولیدی سیاحت' (Fertility Tourism) کا نام دیا گیا ہے۔ بعض اسپرم بینک اپنے یہاں محفوظ اسپرم کو تولیدی علاج (Fertility Treatment) کے علاوہ دیگر کاموں میں بھی

استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً وہ زائد از ضرورت نمونوں کو اندرون ملک یا بیرون ملک دیگر اسپرم بینکس کو فروخت کر دیتے ہیں۔ بعض بینک اسپرم کو قابل استعمال بنانے (Processing)، محفوظ کرنے اور سپلائی کرنے کو بزنس بنا لیتے ہیں۔ بعض بینک تعلیمی اور تحقیقی مقاصد سے، متعلقہ اداروں کو اسپرم فراہم کرتے ہیں۔ اس چیز نے موجودہ دور میں بین الاقوامی تجارت کی شکل اختیار کر لی ہے، جس میں دنیا بھر کے ممالک شریک ہیں۔ ڈنمارک دنیا کا ایسا ملک ہے جو سب سے زیادہ اسپرم ایکسپورٹ کرتا ہے۔

اسپرم بینک۔ مغربی کلچر کی دین

بانجھ پن اور تولیدی صلاحیت سے محرومی یوں تو صحت عامہ کے ایسے مسائل ہیں جو پوری دنیا میں عام ہیں، لیکن خاص طور سے انھوں نے مغربی ممالک میں خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کا بنیادی سبب وہ کلچر اور طرز معاشرت ہے جو مغرب کی پہچان بن گیا ہے۔ وہاں عورتوں کو بے محابا آزادی حاصل ہے۔ اباحیت عروج پر ہے۔ جنسی تسکین کے لیے کوئی بھی ذریعہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ صنف مخالف سے جنسی تعلق اگر زور زبردستی قائم کیا جائے تب تو وہ جرم اور قابل تعزیر ہے، لیکن اگر اس میں دونوں فریقوں کی مرضی شامل ہو تو اس پر کوئی روک ٹوک اور قید نہیں، حتیٰ کہ خلاف وضع فطرت جنسی اعمال کو بھی قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے۔ کسی چیز کا ضرورت سے زیادہ اور غلط طریقے سے استعمال موجب فساد ہوتا ہے۔ یہی معاملہ مغرب میں جنس (Sex) کے سلسلے میں ہوا ہے۔ جنسی آوارگی، اباحیت اور انارکی کا نتیجہ وہاں مردوں میں تولیدی صلاحیت سے محرومی اور عورتوں میں بانجھ پن کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر ان مسائل کا جو حل تلاش کیا گیا اس میں انسانی قدروں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس انحراف کے نتیجے میں انسانی معاشرہ جن سماجی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہوتا ہے، ان سے مکمل صرف نظر کر لیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ مصنوعی تلقیح اور اسپرم بینک کے تصورات خالص مغربی کلچر کی پیداوار ہیں۔ یہ جدید سائنسی طریقے بہ ظاہر بعض مسائل کو حل کرنے کے لیے ایجاد کیے گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں، جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔

نظامِ خاندان پر کاری ضرب

اسپرم بینک کے رواج نے خاندان کے استحکام کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ نسلِ انسانی کے تسلسل کے لیے فطرت نے زوجین کو ایک دوسرے کا محتاج اور ضرورت مند بنایا تھا۔ شوہر کا یہ احساس کہ بیوی کی کوکھ میں اس کا بچہ پل رہا ہے، اسے بیوی کی مسلسل خبر گیری اور نگہ داشت رکھنے، اس کی تمام ضرورتیں پوری کرنے اور اس کی سرپرستی کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور بیوی کا یہ احساس کہ قدرت کا یہ انمول تحفہ اسے شوہر کے ذریعہ ملا ہے، اس کے دل میں شوہر کی قدر و منزلت اور محبت پیدا کرتا تھا۔ اسپرم بینک کے ذریعے اجنبی مرد کے نطفے سے مصنوعی بارآوری کے عمل نے دونوں کو ان احساسات سے عاری کر دیا ہے اور ان کا باہم جذباتی تعلق ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ دونوں بسا اوقات مالی اور مادی منفعتوں کے حصول کے لیے ایک ساتھ رہتے ہیں، ورنہ ان کے درمیان محبت و مودت اور انسیت کا تعلق نہیں رہتا۔

مغرب میں ہم جنسیت (Homosexuality) کے فروغ اور آزادیِ نسواں کے نتیجے میں صورتِ حال میں مزید بگاڑ آگیا ہے۔ عورت کے عورت کی جانب جنسی میلان کو فطری قرار دے کر ان کے درمیان باہم شادی کو قانونی جواز فراہم کر دیا گیا ہے۔ ایسی عورتوں کی بھی خاصی تعداد ہو گئی ہے جو روایتی نکاح کو مردوں کی بالادستی قرار دے کر اس سے انکاری ہیں۔ چنانچہ وہ تنہائی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ پھر ان کی ممتا جاگتی ہے تو وہ اسپرم بینکوں سے رجوع کر کے اور وہاں سے اپنی پسند کے اسپرم حاصل کر کے مصنوعی تلقیح کروا لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ملکوں میں خاندانی نظام چرمرا کر رہ گیا ہے۔

نسب کی پامالی

نظامِ خاندان کے تحت اور شوہر کے نطفے سے تولید کی صورت میں افرادِ خاندان کے درمیان گہرا اور قریبی تعلق قائم ہوتا ہے۔ رشتوں کی پاس داری کی جاتی ہے۔ ان کے درمیان محبت و مودت استوار ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے اور ان کی ادائیگی کی

کوشش کرتے ہیں۔ اسی بنا پر انسانوں میں اپنے نسب کی حفاظت کی فطری خواہش پائی جاتی ہے۔ باپ اپنے بیٹوں کو عزیز رکھتا ہے اور بیٹے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کا باپ کون ہے؟ اسپرم بینک کے رواج نے تصورِ نسب کو قصۂ پارینہ بنا دیا ہے۔ یہ بینک اسپرم کے عطیہ دہندگان کے ذاتی اوصاف وخصوصیت کا تو ریکارڈ رکھتے ہیں، لیکن ان کی شناخت کو عموماً ظاہر نہیں کرتے۔ اگرچہ بعض ملکوں میں ایسے قوانین بنائے گئے ہیں کہ عطیہ دہندگان کے مکمل احوال وکوائف اور شخصی معلومات کا بھی ڈاٹا تیار کیا جائے، اس لیے کہ پیدا ہونے والے بچے کا یہ بنیادی حق سمجھا جاتا ہے کہ اگر بالغ ہونے کے بعد وہ یہ جاننا چاہے کہ اس کا باپ کون ہے؟ تو اسے صحیح معلومات حاصل ہوسکیں۔ لیکن نہ عطیہ دہندگان اپنے نجی کوائف کو ریکارڈ کروانا چاہتے ہیں، نہ اسپرم کا عطیہ حاصل کرنے والی عورتوں کو اس سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اسپرم بینکوں میں محفوظ ذخیرہ کا غالب حصہ اسپرم کے مجہول نمونوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

انسانی تجارت کا پیش خیمہ

زمانۂ قدیم میں انسانی تجارت عام تھی۔ انسانوں کو خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ ان کی منڈیاں قائم تھیں اور بازار لگتے تھے، جہاں ان کی بولیاں لگائی جاتی تھیں۔ خواہش مند آتے اور اپنی پسند کے غلام اور لونڈیاں چھانٹ کرلے جاتے تھے۔ ان سے خود کام لیتے اور اپنے اعزہ و اقارب کو تحفے میں دیتے تھے۔ پھر زمانہ بدلا، بیداری آئی، انسانی عظمت و رفعت کا احساس جاگا تو انسانوں کی خرید و فروخت کو قابلِ نفرت سمجھا جانے لگا، اس سلسلہ میں نئے قوانین وضع کیے گئے اور بالآخر پوری دنیا میں اس پر پابندی عائد کردی گئی۔

اسپرم بینک نے آج نئے انداز سے انسانی تجارت کا دروازہ کھول دیا ہے۔ انسانی تخلیق میں کام آنے اور واسطے بننے والی ہر چیز آج خریدی اور بیچی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اسے کرایے پر فراہم اور حاصل کیا جاسکتا ہے، چاہے وہ عورت کا بیضہ ہو یا مرد کا اسپرم، یا ان دونوں کی تلقیح اور اس کے بعد جنین کی پرورش کے لیے عورت کا رحم۔ مزید برآں یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ خواہش مند جس کوالٹی کا اسپرم چاہیں، انھیں مل سکتا ہے۔ کسی لمبے شخص کا، گورے کا، اعلی

تعلیم یافتہ کا، بزنس مین کا، سائنس داں کا، حتیٰ کہ نوبل انعام یافتہ کا۔ جن خصوصیات کے حامل شخص کا بھی اسپرم مطلوب ہو، تجارتی منڈی میں وہ دست یاب ہے۔ اس کی مقررہ قیمت ادا کرکے اسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اب تک یہ چیزیں الگ الگ فراہم تھیں۔ بچے چاہنے والوں کے پاس جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ اسے خرید کر حسبِ ضرورت بچے پیدا کروا لیتے ہیں۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب ان چیزوں کی تجارت کرنے والے خود بچے پیدا کروا کے بین الاقوامی مارکیٹ میں انھیں فروخت کے لیے پیش کرنے لگیں گے۔

اسلام کا نقطۂ نظر

اسلام نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے متعلق رہنمائی کی ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان کیسے تعلقات ہوں؟ ان کی جنسی خواہشات کی تکمیل کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ خاندانی زندگی کیسے گزاری جائے؟ ان تمام امور سے متعلق اصولی باتیں اس نے کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ ان کی روشنی میں مصنوعی تلقیح اور اسپرم بینک کے بارے میں اسلام کا موقف بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

کسی اجنبی مرد کے نطفے سے بار آوری زنا کے مترادف ہے

اسلام نے نسلِ انسانی کے تسلسل کا واحد جائز ذریعہ نکاح کو قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک صرف نکاح کے بعد ہی مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق کو قانونی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ماورائے نکاح جنسی تعلق کو وہ زنا قرار دیتا ہے اور اسے انتہائی گھناؤنا عمل قرار دیتے ہوئے اس سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ○ (الاسراء: ۳۲)

”زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔“

اور اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

ما من ذنب بعد الشرك أعظم عند الله من نطفة وضعها

رجل فی رحم لا یحل له(۱)

"بارگاہ الٰہی میں شرک کے بعد اس سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں کہ آدمی اپنا نطفہ کسی ایسے رحم میں ڈالے جو اس کے لیے حلال نہ ہو۔"

امام فخر الدین رازیؒ نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ زنا میں بہت سے سماجی، تمدنی اور اخلاقی مفاسد پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے اسلام میں اسے حرام قرار دیا گیا ہے(۲)۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے جس طرح نکاح کے بغیر مرد اور عورت کا جنسی تعلق حرام ہے، اسی طرح شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے نطفے سے عورت کے بیضے کی مصنوعی تلقیح بھی حرام ہے۔ اس بنا پر اسلام ضروری قرار دیتا ہے کہ جن افراد کے نطفے اور بیضے سے جنین کی تخلیق ہو لازماً وہ رشتۂ ازدواج میں بندھے ہوئے ہوں۔ اس کے نزدیک نہ شوہر کے نطفے سے کسی اجنبی عورت کے بیضے کی بارآوری جائز ہے اور نہ بیوی کے بیضے کو کسی اجنبی مرد کے نطفے سے بارآور کیا جاسکتا ہے۔

شیخ محمود شلتوت، سابق شیخ الجامع الازہر مصر نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے:

أمّا اذا كان التلقيح بماء رجل أجنبي عن المرأة لا يربط بينهما عقد زواج فانه يكون فى نظر الشريعة الاسلامية ذات التنظيم الانسانى الكريم جريمة منكرة واثماً عظيماً يلتقي مع الزنا فى إطار واحد جوهرهما واحد و نتيجتهما واحدة(۳)

"اگر تلقیح اجنبی مرد کے نطفے سے ہو اور عورت اور مرد رشتۂ ازدواج سے منسلک نہ ہوں تو اسلامی شریعت، جس نے انسانی تعلقات کے لیے پاکیزہ ضابطے بنائے ہیں، اس

---

(۱) ابن ابی الدنیا، کتاب الورع، حدیث نمبر ۱۳۷۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، تفسیر الاسراء: ۳۲۔ یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے، لیکن اس کا مضمون قرآنی آیات اور دیگر احادیث سے ثابت ہے۔

(۲) فخر الدین رازی، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، تفسیر آیت الاسراء: ۳۲

(۳) الشیخ محمود شلتوت، الفتاوی، ص ۲۸۱

کی نظر میں سنگین جرم اور عظیم گناہ ہے۔ یہ زنا ہی کی ایک شکل ہے۔ دونوں کا جوہر ایک ہے اور دونوں کا نتیجہ بھی ایک ہے۔"

عمدہ نطفے کا انتخاب - جاہلی طریقہ

اسپرم بینک خواہش مندوں کو یہ سہولت بھی فراہم کرتے ہیں کہ وہ اپنی پسند کے عمدہ اسپرم کا انتخاب کر سکیں۔ اس ذوق کی تسکین کے لیے نوبل انعام یافتگان کا اسپرم بینک قائم کیا گیا تھا۔ یہ سراسر جاہلی طریقہ ہے، جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے ان سے بیان کیا کہ عہدِ جاہلیت میں نکاح (مرد و عورت کے درمیان جنسی تعلق) کے چار طریقے رائج تھے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا:

> كان الرجل يقول لامرأته اذا طهرت من طمثها ارسلي الى فلان فاستبضعي منه ويعتزلها زوجها ولا يمسها أبداً حتّى يتبيّن حملها من ذلك الرجل الذي تستبضع منه فاذا تبيّن حملها أصابها زوجها اذا احبّ. وانما يفعل ذلك رغبة في نجابة الولد، فكان هذا النكاح نكاح الاستبضاع (۱)
>
> "عورت جب حیض سے پاک ہوتی تو اس کا شوہر اس سے کہتا تھا: تم فلاں شخص کے پاس جاؤ اور اس سے جنسی تعلق قائم کرو۔ اس کے بعد وہ اپنی بیوی سے الگ تھلگ رہتا اور اسے اس وقت تک ہاتھ نہ لگاتا تھا، جب تک اس مرد سے تعلق کے نتیجہ میں اس کا حمل ظاہر نہ ہو جاتا۔ حمل ظاہر ہو جانے کے بعد وہ حسب خواہش اس سے جماع کرتا تھا۔ ایسا اچھی نسل سے اولاد حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ اسے 'نکاح الاستبضاع' کہا جاتا تھا۔"

یہ ایک فرسودہ، بے بنیاد اور گم راہ کن تصور ہے کہ اچھی نسل، اعلیٰ تعلیم یا دیگر عمدہ

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب من قال لا نکاح الا بولی، ح ۵۱۲

خصوصیات کے حامل مرد کے اسپرم سے اگر تلقیح کروائی جائے تو انہی خصوصیات کا حامل بچہ پیدا ہوگا۔ بچے میں موروثی خصوصیات باپ اور ماں دونوں کی طرف سے منتقل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں دیگر عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ Isodora Duncan نامی خاتون نے ایک مرتبہ نوبل انعام یافتہ مشہور انگریز ادیب اور دانش ور جارج برنارڈ شا (م ۱۹۵۰ء) کو لکھا: ”آپ کے پاس دنیا کا سب سے اعلیٰ دماغ ہے اور میرے پاس خوب صورت ترین جسم۔ ہم دونوں مل کر ایک اعلیٰ خصوصیات کا حامل بچہ پیدا کر سکتے ہیں۔“ برنارڈ شا نے اس کا یہ جواب دیا: ”عزیزمن! اگر بچے میں میرے جسم اور تمہارے دماغ کی وراثتی خصوصیات منتقل ہو گئیں تو کیا ہوگا؟!“

شوہر کے انتقال کے بعد اس کے محفوظ نطفے سے بار آوری جائز نہیں

پیچھے گزر چکا ہے کہ اگر کسی مرض یا عذر کی وجہ سے زوجین کے درمیان طبعی طور پر جنسی تعلق قائم نہ ہو سکے تو شوہر کے نطفے سے مصنوعی تلقیح کے ذریعے بیوی کو بار آور کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنا نطفہ اسپرم بینک میں جمع کرایا ہو تو کیا اس کی وفات کے بعد بیوی اسے حاصل کر کے اور اس کے ذریعہ بار آور ہو کر بچہ پیدا کر سکتی ہے؟ اسلامی شریعت کی رو سے اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ شوہر کی وفات کے بعد بیوی کا اس سے ازدواجی رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی فقہی اکیڈمیوں میں اس موضوع پر غور و خوض کیا گیا ہے اور تمام فقہاء نے بالاتفاق شوہر کی وفات کے بعد اس کے نطفے سے عورت کی تلقیح کو حرام قرار دیا ہے۔

مجمع البحوث العلمیۃ نے اپنے اجلاس منعقدہ عمان ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۶ء میں فیصلہ کیا کہ:

> ”شوہر کے انتقال کے بعد اس کے نطفے سے بیوی کو بار آور کرنا شرعی طور پر حرام ہے، اس لیے کہ اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی۔ یہ فعل شرعاً حرام ہے، اس لیے کہ یہ ایک مرد کے حیوانات منویہ کو ایسی عورت کے رحم میں ڈالنے کے مثل ہے جو اس کے لیے اجنبی

ہے، کیوں کہ موت نے ان کے درمیان رشتۂ ازدواج کو ختم کر دیا ہے۔“ (۱)

ڈاکٹر ابوالفضل محسن ابراہیم نے اس موضوع پر اسلامی شریعت کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

> ”اسلامی قانون کی رو سے یہ بھی ناجائز ہوگا کہ ایک شوہر اپنا نطفہ مادۂ تولید بینک میں اس خیال سے جمع کرائے کہ اس کی موت کے بعد اسے اس کی بیوی کو حاملہ کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ کیوں کہ موت اس معنی میں رشتۂ ازدواج کو کالعدم کر دیتی ہے کہ عورت عدت پوری کرنے کے بعد کسی دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے۔ لہٰذا شوہر کی موت کے بعد اس کے محفوظ نطفہ سے اس کی بیوی کو حاملہ کرنا بھی ایک ناجائز فعل ہوگا۔“ (۲)

شوہر کی زندگی میں اس کے محفوظ نطفے سے بار آوری کا حکم

اگر کسی شخص نے اپنا نطفہ اسپرم بینک میں جمع کرا دیا ہو، اس کے بعد کسی حادثہ کی وجہ سے وہ جماع پر قادر نہ ہو سکے، یا کسی نوعیت کے علاج کے نتیجے میں اس کی قوتِ مردی ختم ہو گئی ہو، تو کیا بعد میں اس کی زندگی میں اس کے نطفے سے اس کی بیوی مصنوعی تلقیح کروا سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب فقہاء کی تحریروں یا فقہی اکیڈمیوں کے فیصلوں میں صراحت سے تو نہیں ملتا، لیکن ان کے دیگر فیصلوں کی روشنی میں اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم المجمع الفقهي الاسلامي مکہ مکرمہ نے اپنے ساتویں سیمینار منعقدہ ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء اور آٹھویں سیمینار منعقدہ ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء میں اور تنظیم اسلامی کانفرنس کی زیر نگرانی قائم بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے اپنے تیسرے اجلاس منعقدہ عمان (اردن) ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۶ء میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ ”شوہر کے نطفے سے بیوی کی مصنوعی تلقیح، خواہ براہِ راست کی جائے یا بیرونی طور

---

(۱) ملاحظہ کیجیے: شادیۃ الصادق الحسن، حکم الاسلام فی التلقیح الصناعی، مجلۃ العلوم والبحوث الاسلامیۃ، السودان، العدد ۲، فبرائر ۲۰۱۱ء، ص ۹، بحوالہ احمد محمد لطفی، التلقیح الصناعی بین اقوال الاطباء وآراء الفقہاء، طبع ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۳۔ محمد احمد طہ، الانجاب بین التحریم والمشروعیۃ، توزیع: منشأۃ المعارف بالاسکندریۃ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲۰

(۲) جدید حیاتیاتی مسائل اور اسلام، ص ۹۳

پر پہلے ان کے نطفے اور بیضے کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کر لیا جائے، پھر اس بارآور بیضہ کو عورت کے رحم میں منتقل کیا جائے، دونوں صورتیں جائز ہیں۔"(۱) اور یہ معلوم ہے کہ مصنوعی تلقیح تازہ اسپرم کے ذریعے بھی ممکن ہے اور اسپرم بینک میں محفوظ منجمد اسپرم کے ذریعے بھی۔ اس بنا پر جس طرح شوہر کے تازہ اسپرم سے بیوی کی مصنوعی تلقیح جائز ہے، اسی طرح اسپرم بینک میں محفوظ اس کے نطفے سے بھی کی جا سکتی ہے۔

اسپرم بینک کا قیام اور اسپرم کی خرید فروخت

گزشتہ تفصیل سے واضح ہوا کہ اسپرم بینک سے استفادہ کی بیش تر صورتیں اسلامی شریعت کی رو سے حرام ہیں۔ اگرچہ مغربی ممالک میں اسے بہت زیادہ رواج مل گیا ہے اور مغربی کلچر کے زیر اثر دنیا کے بیش تر ممالک میں اسپرم بینک قائم ہو گئے ہیں، لیکن اس کے متنوع مفاسد کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لیے نہ اسپرم بینک کا قیام جائز ہے نہ وہاں سے اسپرم کی خرید وفروخت کی اجازت ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ بن محمد الطیار، استاذ الدراسات العلیا، کلیۃ الشریعۃ و الدراسات العلیا، جامعۃ القصیم، سعودی عرب نے اپنے ایک مقالے میں اس موضوع سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "بانجھ پن پوری دنیا اور خاص کر مغربی دنیا کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس لیے اس کے علاج کا جو طریقہ بھی ہو، اسے علمی حلقوں اور عوام میں قبول عام حاصل ہوتا ہے۔ اولاد کے حصول کے لیے بہت سے طریقے رائج ہو گئے ہیں، لیکن وہ شرعی طور پر جائز نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک ناجائز طریقہ مرد کے نطفے کی خرید وفروخت اور مصنوعی تلقیح میں اس کا استعمال ہے۔ مغرب میں اس کے لیے مخصوص بینک قائم ہو گئے ہیں، جہاں نطفے جمع کیے جاتے ہیں اور لوگ اپنی پسند کے نطفے وہاں سے خریدتے ہیں۔ یہ چیز

---

(۱) ملاحظہ کیجیے: رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم مجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے، ص ۱۴۳، ۲۰۵-۲۰۶، جدید فقہی مسائل اور ان کا مجوزہ حل (بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے فقہی اجلاسوں کی قراردادیں اور سفارشات)، ص ۵۱

اسلام میں مطلق حرام ہے۔ اس میں بہت سے مفاسد پائے جاتے ہیں۔ اس طریقے سے ایسے بچے پیدا ہوں گے جن کا صحیح نسب غیر معروف ہوگا۔ معنوی تلقیح کا جواز صرف بانجھ پن اور عدم تولید کی چند مخصوص حالتوں میں ہی ہو سکتا ہے، جب کہ اس میں مادی، معاشرتی، اخلاقی اور قانونی اعتبار سے بہت سے مفاسد ہیں۔ معنوی تلقیح کے یہ جدید طریقے صحیح شرعی نکاح کو کالعدم کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔ ان سے فطرت کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، اخلاقی اور اجتماعی مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور دنیا میں ایسی نسل ظاہر ہو رہی ہے جس کا نسب معلوم نہیں اور ایسے خاندان وجود میں آ رہے ہیں جن کے درمیان رشتۂ ازدواج نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نطفہ کی خرید و فروخت حرام ہے اور مسلمانوں کے لیے اسپرم بینک قائم کرنا جائز نہیں۔ یہ عمل شرعاً حرام ہے اس لیے کہ اس میں بہت سے غیر شرعی کام لازم آتے ہیں، جن سے فطرت سلیمہ ابا کرتی ہے۔" (۱)

اسپرم بینک خدائی ہدایات اور الٰہی شریعت سے بے پروا مغربی تہذیب کا شاخسانہ ہے۔ اس سے اجتناب کے ساتھ اس کے اخلاقی، سماجی اور روحانی مفاسد کو بھی نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

---

(۱) د۔ عبداللہ بن محمد الطیار، الضوابط الشرعیۃ فی المعاوضۃ علی الحقوق والالتزامات،
www.m-islam.net، بحث: بیع المنی

رحمِ مادر میں بچیوں کا قتل

عہد حاضر کے جن سماجی مسائل نے نہ صرف ہمارے ملک، بلکہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، ان میں سے ایک رحمِ مادر میں بچیوں کا قتل ہے۔ لڑکیوں کا وجود اپنے ساتھ اتنے مسائل لے کر آتا ہے کہ ان سے گھبرا کر لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکیاں پیدا ہی نہ ہوں۔ اس کے لیے نت نئی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ سائنسی ترقی نے ایسے آلات اور مشینیں ایجاد کرلی ہیں، جن سے رحم مادر ہی میں جنین کی جنس کا پتا لگا لیا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ مادہ (Female) ہو تو بڑی بے دردی کے ساتھ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں کی جاتی کہ کہیں اس عمل کی انجام دہی میں ماں کی زندگی ہی داؤں پر نہ لگ جائے۔ سماجی مصلحین پریشان ہیں، مگر اس برائی کے انسداد کے لیے کوئی موثر تدبیر انھیں سجھائی نہیں دیتی۔ حکومتی سطح پر مختلف قوانین وضع کیے گئے ہیں، جن میں اس گھناؤنے عمل کو انجام دینے والوں اور ان کا تعاون کرنے والوں کے لیے سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ سرکاری مشنریاں ان سزاؤں کے نفاذ کے لیے کوشاں بھی رہتی ہیں، مگر ان کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو رہی ہے۔ یہ بیماری انسانی سماج میں کینسر کی طرح پھیلتی جا رہی ہے اور نظامِ تمدن کو اندر سے کھوکھلا کر رہی ہے۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ان حالات میں اسلام سامنے آتا ہے اور اس سماجی مرض سے نپٹنے کے لیے موثر رہنمائی کرتا ہے۔ وہ صورت حال کا گہرائی سے تجزیہ کرتا ہے، اس کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالتا ہے، اس کے برے نتائج سے خبردار کرتا ہے اور اس کے انسداد کی تدابیر بتاتا ہے۔ اہم بات یہ کہ ان

تدابیر کو اختیار کر کے ماضی میں ایک بار اس سماجی برائی کا مکمل خاتمہ کیا جا چکا ہے۔ اس لیے عقل و انصاف کا تقاضا ہے کہ جو لوگ اس برائی کو ختم کرنے کے واقعی خواہش مند ہیں اور اس کے انسداد کے لیے کی جانے والی کوششوں میں حقیقتاً سنجیدہ ہیں وہ اسلام کے بتائے ہوئے نسخے کو آزمائیں اور جن تدابیر کی طرف اس نے رہ نمائی کی ہے انھیں روبہ عمل لائیں۔

نسلِ انسانی کے وجود و تسلسل کا فطری نظام

اس کائنات میں رنگ و بو، چہل پہل و نشاط اور حرکت و حرارت انسان کے دم سے ہے۔ وہ اس کا گل سر سبد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ نسلِ انسانی کی بقا و تحفظ اور تسلسل و استمرار کے لیے اللہ تعالیٰ نے 'زوجیت' کا قانون نافذ کیا ہے۔ اس نے انسانوں ہی نہیں، بلکہ حیوانات، نباتات اور دیگر مخلوقات کو بھی جوڑے جوڑے بنایا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

> سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ
> اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ۝ (یٰس: ۳۶)

> "پاک ہے وہ ذات، جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے، خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔"

دوسرے مقام پر قرآن مجید کہتا ہے:

> فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ
> مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ یَذْرَؤُكُمْ فِیْهِ ؕ (الشوریٰ: ۱۱)

> "آسمانوں اور زمین کا بنانے والا، جس نے تمھاری اپنی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے، اور اسی طرح جانوروں میں بھی (انھی کے ہم جنس) جوڑے بنائے۔ اس طریقے سے وہ تمھاری نسلیں پھیلاتا ہے۔"

انسانی جوڑا مرد اور عورت پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کی یکجائی سے خاندان کی اکائی وجود

میں آتی ہے۔ خاندان میں بیٹے، بیٹیاں، پوتے، پوتیاں، پرپوتے، پرپوتیاں اور دیگر متعلقین ہوتے ہیں۔ اس طرح نسل انسانی کا سلسلہ چلتا اور آبادی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ
اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (النحل:۷۲)

”اور وہ اللہ ہی ہے، جس نے تمھارے لیے تمھاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمھیں بیٹے پوتے عطا کیے۔“

دوسری جگہ ارشاد ہے:

الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ
مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (النساء:۱)

”جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔“

اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے تسلسل اور اس میں مردوں اور عورتوں کے توازن کا مخصوص نظام رکھا ہے، جو انتہائی حکمت پر مبنی ہے۔ اس سے اس کی قدرت کاملہ اور مشیت مطلقہ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے صرف لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے صرف لڑکوں سے نوازتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں دونوں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے دونوں سے محروم رکھتا ہے۔ بہ ہر حال نر (Male) اور مادہ (Female) جنسوں میں توازن برقرار رہتا ہے۔ چناں چہ تاریخ انسانی کے کسی دور میں اور کسی خطۂ زمین میں ایسا نہیں ہوا کہ صرف لڑکے پیدا ہوئے ہوں اور لڑکیوں کی کمی ہو گئی ہو، یا صرف لڑکیوں کی پیدائش ہوئی ہو اور ان کے نکاح کے لیے لڑکے نہ ملے ہوں۔ قرآن کریم میں اللہ کی اس حکمت بالغہ کا یوں تذکرہ ہے:

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ
اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۙ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ
يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (الشوریٰ:۴۹،۵۰)

"اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے۔"

نظامِ فطرت میں انسانی دخل اندازی سے عدمِ توازن پیدا ہوا ہے

اللہ تعالیٰ نے نظامِ کائنات کو محکم قوانین اور پختہ اصولوں کے تابع کیا ہے۔ انسان نے جب بھی کسی قانونِ الٰہی کو توڑا ہے وہ فتنہ و فساد کا باعث ہوا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم: ۴۱)

"خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔"

تخلیقِ انسانی کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے جاری کردہ فطری نظام میں انسانی دخل اندازی سے پیدا ہونے والے فساد، خلل اور عدمِ توازن کا مشاہدہ آج کل کھلی آنکھوں سے ہو رہا ہے اور انسانی معاشرہ اس کے تلخ نتائج جھیل رہا ہے۔

کچھ عرصہ قبل بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کے مسئلے کو ہوا بنا کر پیش کیا گیا۔ اس سے نپٹنے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی (Family Planning) کی اسکیمیں بنائی گئیں اور ضبطِ ولادت (Birth Control) کے قوانین وضع کیے گئے۔ معاملہ آگے بڑھا تو اب تعیینِ جنس (Sex Determination) کی کوششیں کی جاتی ہیں اور مختلف آلات کا سہارا لے کر یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ رحمِ مادر میں پرورش پانے والا جنین لڑکا ہے یا لڑکی؟ اگر رپورٹ میں لڑکی کی تعیین ہو جاتی ہے تو اس کا اسقاط (Abortion) کروایا جاتا ہے اور اسے جینے کے حق سے محروم کر کے اس کا خاتمہ (Termination) کر دیا جاتا ہے۔

یہ مظہر (Phenomenon) کسی ایک خطۂ زمین کا نہیں ہے، بلکہ اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ نوعِ انسانی کی پوری آبادی کو دیکھا جائے، کسی ملک کی آبادی پر نظر ڈالی جائے یا اس کے کسی صوبے یا شہر کی آبادی کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے، ہر جگہ لڑکوں اور لڑکیوں کا تناسب غیر متوازن نظر آتا ہے۔ اس وقت پوری دنیا کی مجموعی آبادی میں لڑکوں اور

لڑکیوں کا تناسب ۱۰۰ لڑکیوں پر ۱۰۳ـ۱۰۷ لڑکوں کا ہے۔

فرانس کے National Institute of Demographic Studies کے ذریعے اکتوبر ۲۰۰۵ میں چین کا ایک سروے کرایا گیا۔ اس کے مطابق وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کا تناسب ۱۰۰ لڑکیوں پر ۱۲۳ لڑکوں کا ہے۔ سروے رپورٹ میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ اگر چین میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش میں یہ فرق جاری رہا تو ۲۰۱۵ اور ۲۰۳۰ کے درمیان ڈھائی کروڑ نوجوانوں کو شریکِ حیات ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ دیگر ملکوں کی صورت حال بھی اس سے بہتر نہیں ہے۔

ہندستان میں ہر دس سال پر سرکاری سطح پر مردم شماری ہوتی ہے۔ ۲۰۱۱ میں ملک کی آبادی ایک ارب اکیس کروڑ کو پار کر گئی ہے۔ ان میں مردوں کی تعداد باسٹھ کروڑ اکتیس لاکھ اکیس ہزار اور عورتوں کی تعداد اٹھاون کروڑ چوہتر لاکھ سینتالیس ہزار بتائی گئی ہے۔ گویا ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں نو سو تینتالیس (۹۴۳) عورتیں ہیں۔ چھ سال سے کم عمر کے بچوں میں یہ فرق اور بھی زیادہ ہے، کہ ایک ہزار بچوں کے مقابلے میں نو سو انیس (۹۱۹) بچیاں ہیں، جب کہ ۲۰۰۱ کی مردم شماری میں یہ فرق ایک ہزار کے مقابلے میں نو سو ستائیس (۹۲۷) کا تھا۔

ریاستوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ملک کی کئی ریاستوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان تناسب انتہائی غیر مساوی ہے۔ ان میں خاص طور سے پنجاب، دہلی، جموں و کشمیر، چنڈی گڑھ، سکم اور انڈمان و نکوبار خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان ریاستوں میں ایک ہزار لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد ۸۰۰ـ۹۰۰ کے درمیان ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے تناسب میں ان بڑھتے ہوئے فرق نے عالمی سطح پر مفکرین اور سماجی مصلحین کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہر جگہ اس کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا جارہا ہے اور اصلاح کی تدابیر سوچی جارہی ہیں۔

سماج میں لڑکیوں کی کم تر حیثیت

لڑکیوں کو جو اَن چاہی (Unwanted) مخلوق کا مرتبہ دیا گیا ہے اور ان کی پیدائش

سے قبل ہی ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ سماج میں لڑکیوں کو کم تر حیثیت حاصل ہے۔ انھیں لڑکوں کے مقابلے میں کم مفید سمجھا جاتا ہے۔ ان کے وجود کو والدین اپنے اوپر بار محسوس کرتے ہیں۔ ان کی پرورش و پرداخت اور عصمت و عفت کی حفاظت کے جھمیلوں کے علاوہ ان کے نکاح میں دشواریاں آتی ہیں اور اس موقعے پر زیادہ مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور دیگر بہت سے نازک مسائل ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے والدین اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں کہ پیدائش سے قبل ہی ان کا قصہ پاک کردیا جائے اور ان سے گلوخلاصی حاصل کرلی جائے۔

لڑکیوں کے بارے میں یہ تصور آج کے دور کی دین نہیں ہے، بلکہ ماضی میں بھی ان کے بارے میں انسانی نفسیات یہی رہی ہیں۔ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ حضرت مریم کی ماں نے نذر مانی تھی کہ ان کے جو اولاد ہوگی اسے ہیکل کی خدمت کے لیے نذر کردیں گی اور چوں کہ اس زمانے میں ہیکل کی خدمت مرد انجام دیتے تھے، اس لیے انھوں نے امید لگا رکھی تھی کہ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوگا، لیکن جب ان کے لڑکی پیدا ہوئی تو مارے حسرت و یاس کے ان کی زبان پر یہ کلمات آگئے:

رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ ... وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ

(آل عمران: ۳۶)

”مالک، میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے... اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔“

نزولِ قرآن کے زمانے کی صورت حال

لڑکیوں کو یہی حیثیت سرزمین عرب میں اس زمانے میں حاصل تھی جب اللہ کے نبی حضرت محمد ﷺ کی وہاں بعثت ہوئی۔ لوگ انھیں بھاری بوجھ سمجھتے تھے اور ان کی پرورش اور کفالت سے گھبراتے تھے۔ اس لیے کہ ان سے امید نہیں ہوتی تھی کہ وہ بڑی ہوکر معاشی تگ و دو میں ان کا ہاتھ بٹائیں گی۔ ان کے بارے میں اندیشہ ہوتا تھا کہ مناسب رشتہ نہ ملنے پر غیر کفو میں ان کا نکاح کرنا پڑے گا۔ خطرہ ہوتا تھا کہ لٹیرے حملہ آور ہوں گے تو انھیں پکڑ کر لے جائیں گے

اور انھیں لونڈیاں بنالیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان میں سے کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تھی تو اس کا چہرہ اتر جاتا تھا۔ وہ کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بچی کو زندہ رہنے دے اور اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہے یا گڈھا کھود کر اس میں دفن کردے اور ہمیشہ کے لیے اس سے پیچھا چھڑالے۔ قرآن نے اس زمانے کے انسان کی سوچ پر بھرپور تبصرہ کیا ہے اور بڑی بلیغ تصویر کشی کی ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۚ ۝
يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ
يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ (النحل: ۵۸، ۵۹)

”جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟“

اہل عرب کا ایک عقیدہ یہ تھا کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ قرآن نے ان کے اس عقیدے پر جابجا ضرب لگائی ہے۔ (ملاحظہ کیجیے النحل: ۵۷، بنی اسرائیل: ۴۰، الطور: ۳۹، النجم: ۲۱، ۲۲) ایک مقام پر وہ انھیں غیرت دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ تمھارا اپنا حال تو یہ ہے کہ تم اپنے لیے بیٹیاں پسند نہیں کرتے۔ اگر تمھارے یہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو مارے غم کے تمھارے چہرے پر سیاہی چھا جاتی ہے، مگر تمھیں اللہ کی طرف بیٹیاں منسوب کرنے میں ذرا بھی عار نہیں آتا۔ (الزخرف: ۱۶، ۱۷) دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ جب انھوں نے فرشتوں کی تخلیق اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی تو وہ کیوں کر انھیں 'بیٹیاں' قرار دے رہے ہیں؟ لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو جنس وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر رہے ہیں:

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ
اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ

تَحْكُمُونَ ۝ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ (الصّٰفّٰت: ۱۴۹-۱۵۵)

”پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو، کیا (ان کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمھارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟ کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سن رکھو، دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کرلیں؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے حکم لگا رہے ہو؟“

لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا۔ ایک جاہلی رسم

لڑکیوں سے نجات پانے کے لیے عہدِ جاہلیت (اسلام سے قبل کا زمانہ) میں عرب کے بعض قبیلوں میں ایک طریقہ رواج پا گیا تھا جو بڑا گھناونا، قابلِ نفرت اور شرمناک تھا۔ اگر ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ اسے فوراً ہلاک کر دیتے تھے۔ اس کے لیے وہ مختلف تدابیر اختیار کرتے تھے:

— جب وضعِ حمل کا زمانہ قریب آتا تو ایک گڑھا کھود دیا جاتا تھا۔ پھر اگر لڑکی پیدا ہوتی تو پیدائش کے فوراً بعد اسے اس گڑھے میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ (ابن عباسؓ)

— لڑکی پیدا ہوتے ہی اسے مار کر کتے کے آگے ڈال دیا جاتا تھا۔ (قتادہؒ)

— کسی پہاڑ کی چوٹی پر لے جاکر پھینک دیا جاتا تھا۔

— پانی میں ڈبو دیا جاتا تھا۔

— ذبح کر دیا جاتا تھا۔

— اسے پیدا ہونے کے بعد زندہ رہنے دیا جاتا تھا۔ پھر جب وہ کچھ بڑی ہو جاتی تھی (چھ بالشت کی ہو جاتی تھی) تو ایک دن اسے خوب سجا سنوار کر صحرا میں لے جایا جاتا تھا، جہاں خوب گہرا گڈھا کھود کر اس میں ڈھکیل دیا جاتا تھا اور اوپر سے مٹی برابر کر دی جاتی تھی۔(۱)

() فخر الدین رازی، تفسیر کبیر: ۲۰/ ۳۶، ۳۰/ ۷۰۔ ابو عبداللہ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی): ۱۹/ ۲۳۳

یہ عرب کے تمام قبیلوں کا حال نہ تھا، بلکہ صرف چند قبائل اس پر عمل پیرا تھے۔ اور وہ تھے مضر، خزاعہ اور تمیم۔ دوسری جانب اس زمانے کے بعض سماجی مصلحین نے اس گندی رسم کے خلاف زبردست مہم چھیڑ رکھی تھی۔ وہ پتا لگاتے رہتے تھے اور جہاں کہیں انھیں ایسی بچیاں ملتیں وہ انھیں اپنی کفالت اور سرپرستی میں لے لیتے تھے، بلکہ بسا اوقات وہ ان کے والدین کو کچھ معاوضہ بھی دیتے تھے۔ ایسے لوگوں میں صعصعہ بن ناجیہ اور زید بن عمرو بن نفیل کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔(۱)

جدید جاہلیت

بچیوں کو قتل کرنے کی یہ رسم، جو دورِ جاہلی کی یادگار ہے، ہمارے سماج میں اب بھی پائی جاتی ہے اور اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ غیر ترقی یافتہ سماجوں میں تو انہی قدیم طریقوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ چناں چہ ان کے یہاں جنین کی پیدائش تک انتظار کیا جاتا ہے۔ اگر لڑکا پیدا ہوا تو ٹھیک ہے، لیکن اگر لڑکی پیدا ہوئی تو کسی نہ کسی طریقے سے اسے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ راجستھان کے علاقے جیسلمیر کے گاؤں دیوڑا کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ وہاں گزشتہ سو سال میں کوئی لڑکی اتنی بڑی ہوئی ہی نہیں کہ اس کی شادی کی نوبت آتی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہاں لڑکیاں پیدا ہی نہیں ہوتی تھیں، بلکہ پیدا ہوتے ہی انھیں فنا کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ سماجی اور خاندانی دباؤ کی وجہ سے بسا اوقات یہ کام مائیں ہی انجام دیتی تھیں۔ چناں چہ وہ اپنے دودھ کے ساتھ بچی کو افیم کھلا دیتی تھیں، ناک پر ریت کی پوٹلی رکھ دیتی تھیں یا منہ اور ناک میں ریت بھر دیتی تھیں، منہ پر رضائی یا تکیہ رکھ دیتی تھیں، تاکہ آہستہ آہستہ نومولود بچی کا دم گھٹ جائے، یا منہ میں ڈھیر سا نمک بھر دیتی تھیں۔

رہے ترقی یافتہ سماج تو وہاں وضعِ حمل تک کا انتظار بھی نہیں کیا جاتا اور بچیوں کو پیدا ہونے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا، بلکہ اس سے قبل ہی رحمِ مادر کی جانچ (Scanning) کرکے پتا لگا لیا جاتا ہے کہ اس میں پرورش پانے والا جنین لڑکا ہے یا لڑکی؟ اور لڑکی ہونے کی صورت میں حمل

---

(۱) تفسیر قرطبی [illegible]

کروا دیا جاتا ہے۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۱ اور ۲۰۰۵ء کے درمیان اسقاط حمل کے چھ لاکھ بانوے ہزار معاملات سامنے آئے۔ آئے دن ایسی خبریں اخباروں میں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ نا پختہ انسانی جنین کی لاشیں جھیل میں تیرتی ہوئی اور تالاب کے کنارے پڑی ہوئی ملتی ہیں، یا کنوؤں اور جھاڑیوں سے برآمد ہوتی ہیں۔

موجودہ قوانین کی بے بسی

رحم مادر میں قتل جنین کے رجحان پر روک لگانے اور اس کے خلاف فضا بنانے کے مقصد سے غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) سرگرم عمل ہیں اور وہ آئے دن مختلف مہمیں چلاتی رہتی ہیں، لیکن اس کا خاطر خواہ اثر ظاہر نہیں ہو رہا ہے۔ حکومتی سطح پر بھی بعض قوانین بنائے گئے ہیں۔ ہندستان میں ۱۹۹۴ میں ایک قانون بنایا گیا، جس کا نام ہے Natal Diagnostic Technic: Regulation and Prevention of Misuse Act۔ اس کے تحت قبل از پیدائش ٹکنالوجی کے ذریعے بچے کی جنس جاننا غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اس قانون کے بموجب سپریم کورٹ نے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے رحم مادر میں بچے کی جنس معلوم کرنے کو قابل سزا جرم قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود پورے ملک میں بڑی تعداد میں فرٹیلٹی کلینک (Fertility Clinic) چلائے جا رہے ہیں، جہاں یہ غیر قانونی کام جاری ہے اور اس کے ذریعے کروڑوں روپے کا کاروبار چل رہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال دس سے پندرہ ہزار روپے کی فیس کے عوض پانچ سے سات لاکھ لڑکیوں کو رحم مادر میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ کاروبار ایک ہزار کروڑ روپیوں کا ہے۔ وقتاً فوقتاً ان کلینکس پر چھاپہ مارا جاتا ہے، اس کام میں ملوث ڈاکٹروں کو گرفتار کیا جاتا ہے، ان کے خلاف مقدمات چلائے جاتے اور انھیں سزا دی جاتی ہے، مگر ان تمام کوششوں کے باوجود اس سماجی برائی کا خاتمہ تو کیا، اس کے پھیلاؤ کو روکنا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

اسلام کی انسدادی تدابیر

اسلام قتل جنین کو سنگین جرم قرار دیتا ہے۔ اس کو روکنے کے لیے اس نے مختلف تدابیر اختیار کی ہیں۔ وہ لوگوں کے ذہن و دماغ میں اس فعل کی شناعت بٹھاتا ہے۔ جن اندیشوں کی بنا پر لوگ اس کا ارتکاب کرتے تھے وہ اندیشے دور کرتا ہے۔ اس فعل پر آخرت میں سخت وعید سناتا ہے۔ دوسری طرف لڑکیوں کا وجود باعث خیر و برکت قرار دیتا ہے اور ان کی کفالت اور تربیت کرنے کی فضیلتیں بیان کرتا ہے۔ سماجی سطح پر یہ بڑی موثر تدابیر ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان تدابیر کو بروے کار لا کر اسلام نے کامیابی کے ساتھ اس برائی کا مکمل خاتمہ کر دیا تھا۔

آئندہ سطور میں اسلام کی ان تعلیمات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

ذہنی تربیت

اسلام نے سب سے پہلا اور اہم کام یہ کیا کہ اپنے مخاطبین کی ذہنی تربیت کی۔ کوئی قانون اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتا جب تک ان لوگوں میں اسے قبول کرنے کی آمادگی نہ ہو، جن پر اسے نافذ کیا جاتا ہے اور وہ اس کی خوبی اور اس پر عمل نہ کرنے کے نقصان سے اچھی طرح آگاہ نہ ہو جائیں۔ اس زمانے میں اہل عرب اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے ان کے استھانوں پر اپنے بچوں کو بھینٹ چڑھا دیا کرتے تھے، ان کے بعض قبائل مختلف اسباب سے اپنی بچیوں کو پیدائش کے بعد قتل کر دیا کرتے تھے۔ اسلام نے بتایا کہ یہ شیطانی اور مشرکانہ عمل ہے۔ شیطان نے اسے خوش نما بنا کر پیش کیا ہے اور اسے مذہبی رنگ دے دیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے لیے سراسر موجب ہلاکت عمل ہے:

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ
لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ (الانعام: ۱۳۷)

”اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوش نما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔“

اس سیاق میں آگے قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ حماقت اور نادانی میں جو یہ عمل انجام دیتے ہیں یہ ان کے لیے خسارے کا باعث ہے۔ اس لیے کہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کی کس اولاد سے آیندہ اسے کیا فائدہ حاصل ہونے والا ہے اور وہ اس کے لیے کتنی موجب خیر و برکت ہوگی۔ یہ کچھ نہ جانتے ہوئے پیدائش کے بعد ہی اپنی اولاد کی ہلاکت کے درپے ہونا حماقت نہیں تو اور کیا ہے!

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ

(الانعام: ۱۴۰)

”یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ، جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا۔“

اندیشۂ فقر کا ازالہ

عرب کے بعض قبائل اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ فقر و غربت میں وہ لڑکیوں کے وجود کو ایک بوجھ سمجھتے تھے۔ لڑکے تو کچھ بڑے ہو کر ان کا ہاتھ بٹانے لگتے تھے اور وسائلِ زندگی فراہم کرنے میں ان کا ساتھ دینے کے قابل ہو جاتے تھے، لیکن لڑکیاں بڑی ہو جانے پر بھی کچھ نہ کرتی تھیں اور ان کے مصارف کا کل انحصار باپ پر ہوتا تھا۔ قرآن نے واضح کیا کہ رزق کی کنجیاں صرف اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ روئے زمین کی تمام مخلوقات کی روزی کا ذمہ اس نے خود لے رکھا ہے۔ کوئی طاقت ور ہو یا کم زور، ہٹا کٹا ہو یا معذور، خود روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہو یا اس کا انحصار کسی دوسرے پر ہو، اگر اسے روزی ملتی ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کے اذن، مشیت اور تقدیر سے۔ یہ ممکن ہے کہ اس نے ایک انسان کو دوسرے انسان کی روزی کا واسطہ بنا رکھا ہو اور ایک شخص کو دوسرے کے طفیل روزی ملتی ہو۔ اس لیے کسی کو بوجھ سمجھ کر اسے قتل کر دینا بہت بڑی غلطی اور انتہائی نادانی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ

(الانعام: ۱۵۱)

”اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔“

دوسرے مقام پر اسی بات کو اور کھول دیا گیا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ○ (بنی اسرائیل: ۳۱)

”اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔“

لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی حرمت

اسلام میں محض تعلیم و تلقین پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ لڑکیوں کے قتل کا شمار ان کاموں میں کیا گیا ہے جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّهَاتِ وَوَأْدَ الْبَنَاتِ وَ مَنْعَ وَهَاتِ (۱)

”اللہ نے تم پر حرام قرار دیا ہے والدین کی نافرمانی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے اور فضول خرچی۔“

حضرت مغیرہؓ ہی سے مروی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ان کاموں کو رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔(۲)

آخرت میں سخت سزا کی وعید

ساتھ ہی اس شنیع عمل کا شمار ان اعمال میں کیا گیا ہے، جن کے بارے میں روزِ آخرت

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، باب ما ینھی عن اضاعۃ المال، ۲۴۰۸، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر، ۵۹۷۵، صحیح مسلم، کتاب الاقضیۃ، باب النھی عن کثرۃ المسائل، ۵۹۳

(۲) صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ما یکرہ من قیل وقال، ۶۴۷۳، کتاب الاعتصام، باب ما یکرہ من کثرۃ السوال، ۷۲۹۲، صحیح مسلم، کتاب الاقضیۃ، باب النھی عن کثرۃ المسائل، ۵۹۳

بارگاہِ الٰہی میں باز پرس ہوگی اور اس پر سزا دی جائے گی۔ قرآن نے بڑے بلیغ اور دل دہلا دینے والے اسلوب میں اس کا نقشہ کھینچا ہے:

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر: ۸، ۹)

"اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟"

جن لوگوں نے ظلم کیا اور لڑکی کو ناحق قتل کیا ان لوگوں سے براہ راست باز پرس کرنے کے بجائے اس لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس جرم میں اس کی جان لی گئی؟ اس اسلوب بیان میں وہ شدید غضب ناکی پائی جارہی ہے، جس کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے اظہار ہوگا۔ اس کی نگاہ میں بیٹی کو زندہ دفن کرنے والے اتنے قابل نفرت ہوں گے کہ وہ ان سے براہ راست مخاطب بھی نہ ہوگا۔(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولاد کو قتل نہ کرنے کا عہد لیا کرتے تھے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام سے بیعت لیتے وقت ان سے جن باتوں کا اقرار کرواتے تھے ان میں ایک بات یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔ یہ اقرار آپ مردوں اور عورتوں دونوں سے لیتے تھے۔ صلح حدیبیہ (ذی قعدہ ۶ھ) کے بعد اور فتح مکہ (رمضان ۸ھ) سے پہلے بہت سی خواتین مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آگئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان سے بیعت لینے کا حکم دیا۔ من جملہ ان باتوں کے جن پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان خواتین سے بیعت لینے کا حکم دیا گیا، یہ بات بھی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔ قرآن مجید میں ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُؤْمِنَٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰٓ أَن لَّا
يُشْرِكْنَ بِٱللَّهِ شَيْـًٔا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَٰدَهُنَّ وَلَا
يَأْتِينَ بِبُهْتَٰنٍ يَفْتَرِينَهُۥ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِى

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۱۹/ ۲۳۳-۲۳۴ زمخشری، الکشاف: ۳/ ۲۲۲

مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(الممتحنۃ: ۱۲)

"اے نبی جب تمھارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امر معروف میں تمھاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔ یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

روایات میں ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ کو حکم دیا کہ وہ آپ ﷺ کی طرف سے عورتوں سے بیعت لیں اور ان باتوں کا اقرار کروائیں، جن کا تذکرہ اس آیت میں آیا ہے۔(۱) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ پہنچنے کے بعد آں حضرت ﷺ نے ایک موقع پر انصار کی خواتین کو ایک مکان میں جمع کروایا اور حضرت عمرؓ کو ان سے بیعت لینے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے آں حضرت ﷺ کے نمائندہ کی حیثیت سے انصار خواتین سے انھی دفعات پر بیعت لی۔(۲)

اسی طرح کا عہد آں حضرت ﷺ نے مردوں سے بھی لیا تھا۔ ہجرت مدینہ سے قبل یثرب کے جن خوش نصیب لوگوں نے حج کے موقعے پر عقبہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی ان میں حضرت عبادہ بن صامتؓ بھی تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں سے فرمایا:

بَايِعُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ۔

"مجھ سے بیعت کرو اس چیز پر کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، چوری نہیں کرو گے، زنا نہیں کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے۔"

---

(۱) ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۳/ ۶۰۳

(۲) موطا امام مالک، کتاب البیعۃ، باب ما جاء فی البیعۃ، مسند احمد: ۵/ ۸۵، ۶/ ۴۰۳

حضرت عبادہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے ان باتوں پر آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چوں کہ بیعت کی یہ وہی دفعات تھیں، جن پر عورتوں سے بیعت لی گئی (جس کا تذکرہ سورۂ ممتحنہ میں ہے) اس لیے مردوں سے لی جانے والی اس بیعت کو بھی 'بیعۃ النساء' کا نام دیا گیا ہے۔(۱)

لڑکیوں کی پرورش اور کفالت پر جنت کی بشارت

دوسری طرف اسلام نے اس تخیل پر عی کاری ضرب لگائی کہ لڑکی کا وجود ایک بوجھ ہے اور اس کی پیدائش آدمی کے لیے مصیبت اور وجہ پریشانی ہے۔ بلکہ اس نے لڑکی کا وجود باعث سعادت قرار دیا اور اسے جنت کمانے کا ایک ذریعہ بتایا۔ اس مضمون کی بہت سی احادیث مروی ہیں، جن میں لڑکیوں کی خوش دلی کے ساتھ پرورش کرنے، ان کا خرچ اٹھانے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ چند احادیث ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ (وَضَمَّ أَصَابِعَهُ)(۲)

"جس شخص نے دو لڑکیوں کی ان کے بالغ ہو جانے تک کفالت کی وہ روز قیامت مجھ سے اتنا قریب ہوگا (یہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیاں ملائیں)۔"

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ دَخَلْتُ أَنَا وَهُوَ الْجَنَّةَ كَهَاتَيْنِ (و أشار بإصبعيه)(۳)

"جس شخص نے دو لڑکیوں کی کفالت کی، وہ اور میں جنت میں اس طرح داخل

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب وفود الانصار الی النبی ﷺ، ۳۸۹۲، کتاب الاحکام، باب بیعۃ النساء، ۷۲۱۳۔ نیز دیگر مقامات۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب الحدود کفارات لاھلھا، ۱۷۰۹

(۲) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات، ۲۶۳۱

(۳) جامع ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی النفقۃ علی البنات والاخوات، ۱۹۱۴، صحیح الالبانی

ہوں گے (یہ فرماتے ہوئے آپ نے اپنی دو انگلیوں سے اشارہ کیا)۔“

حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَا مِنْ رَجُلٍ تُدْرِكُ لَهُ ابْنَتَانِ فَيُحْسِنُ إِلَيْهِمَا مَا صَحِبَتَاهُ أَوْ صَحِبَهُمَا إِلَّا أَدْخَلَتَاهُ الْجَنَّةَ(۱)

”جس شخص کی دو لڑکیاں ہوں، وہ جب تک اس کے پاس رہیں وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے تو وہ اس کے جنت میں داخلہ کا ذریعہ بنیں گی۔“

حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کو میں نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

مَنْ كَانَ لَهُ ثَلَاثُ بَنَاتٍ فَصَبَرَ عَلَيْهِنَّ وَأَطْعَمَهُنَّ وَسَقَاهُنَّ وَكَسَاهُنَّ مِنْ جِدَتِهِ كُنَّ لَهُ حِجَابًا مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ(۲)

”جس شخص کی تین لڑکیاں ہوں، وہ صبر کرے اور انھیں اپنی حیثیت کے مطابق کھلائے، پلائے اور پہنائے وہ روز قیامت جہنم سے اس کے لیے اوٹ بن جائیں گی۔“

ام المومنین حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک عورت آئی۔ اس کے ساتھ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ میرے پاس اس وقت اسے دینے کے لیے صرف ایک کھجور تھی۔ میں نے اسے دیا۔ اس نے اس کے دو ٹکڑے کرکے آدھا آدھا دونوں لڑکیوں کو دے دیا اور خود کچھ نہیں کھایا۔ پھر اٹھی اور چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں نبی ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپؐ کو اس عورت کا ماجرا سنایا۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ(۳)

---

(۱) سنن ابن ماجہ، ابواب الادب، باب بر الوالد والاحسان الی البنات، ۳۶۷۰، حسنہ الالبانی

(۲) سنن ابن ماجہ، ابواب الادب، باب بر الوالد والاحسان الی البنات، ۳۶۶۹، صححہ الالبانی، مسند احمد، ۴/ ۱۵۴

(۳) صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ، ۱۴۱۸، کتاب الادب، رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ، ۵۹۹۵، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات، ۲۶۲۹

> ’’جو شخص ان لڑکیوں کی وجہ سے کسی طرح کی آزمائش میں مبتلا ہو، اس حال میں وہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے تو وہ لڑکیاں اس کے لیے جہنم سے آڑ بن جائیں گی۔‘‘

حضرت عائشہؓ سے مروی اسی مضمون کی دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے تین کھجوریں دیں (ہوسکتا ہے یہ دوسرے موقع کا واقعہ ہو)۔ اس عورت نے دونوں لڑکیوں کو ایک ایک کھجور دی۔ تیسری کھجور وہ خود کھانے چلی کہ اسے بھی وہ لڑکیاں مانگنے لگیں۔ عورت نے اس تیسری کھجور (جسے وہ خود کھانا چاہ رہی تھی) کے دو ٹکڑے کیے اور آدھا آدھا دونوں لڑکیوں کو دے دیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے اس عورت کا یہ عمل بہت اچھا لگا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا:

> إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَوْجَبَ لَهَا بِهَا الْجَنَّةَ أَوْ أَعْتَقَهَا بِهَا مِنَ النَّارِ (۱)
>
> ’’اللہ نے اس عمل کے بدلے اس عورت کے لیے جنت واجب کردی ہے یا (فرمایا کہ) اسے جہنم سے نجات دے دی ہے۔‘‘

لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی فضیلت

احادیث میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی بھی بہت تاکید کی گئی ہے اور اس کی غیر معمولی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ان کے مطابق جو شخص ان کی مادی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں ادب و اخلاق سکھاتا ہے، ان کی تربیت کرتا ہے اور انھیں علم و حکمت کے زیور سے آراستہ کرتا ہے وہ جنت کو اپنے لیے یقینی بناتا ہے۔ چند احادیث درج ذیل ہیں:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ فَأَدَّبَهُنَّ وَزَوَّجَهُنَّ وَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ (۲)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات، ح ۲۶۳۰

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتیما، ح ۵۱۴۷ علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے

”جس شخص نے تین لڑکیوں کی پرورش کی، انھیں ادب سکھایا، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا رہا تو اس کے لیے جنت ہے“

ایک دوسری حدیث میں، جسے حضرت ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے، آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ أَوْ مِثْلَهُنَّ مِنَ الْأَخَوَاتِ فَأَدَّبَهُنَّ وَ رَحِمَهُنَّ حَتّٰى يُغْنِيَهُنَّ اللّٰهُ أَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ الْجَنَّةَ

”جس شخص نے اپنی تین بیٹیوں یا تین بہنوں کی کفالت کی، انھیں ادب سکھایا، ان کے ساتھ ہم دردی کا معاملہ کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے نیاز کر دیا، اس کے لیے اللہ نے جنت واجب کر دی ہے۔“

راوی کہتے ہیں کہ یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اگر کسی کے دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ ایسا سلوک کرے؟ آپ نے فرمایا: اس کے لیے بھی یہی اجر ہے۔ راوی مزید کہتے ہیں کہ اگر حاضرین میں سے کسی نے ایک لڑکی یا بہن کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں دریافت کیا ہوتا تو بھی آپ یہی جواب دیتے۔(۱)

اسلام کی یہ تعلیمات لڑکیوں کو سماج میں اتنی عظمت و رفعت عطا کرتی ہیں کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جن سماجوں میں لڑکیوں کے حقوق مسلوب ہیں یا انھیں کم تر حیثیت دے دی گئی ہے انھیں ان کی حالت سدھارنے، ان کا مقام بلند کرنے اور ان کی بے وقعتی دور کرنے کے لیے اسلام کی ان تعلیمات کو مشعلِ راہ بنانا چاہیے۔

☆☆☆

---

(۱) بغوی، شرح السنۃ، کتاب البر والصلۃ، باب ثواب کافل الیتیم، ۳۴۵۷۔ یہ حدیث ضعیف ہے

گھریلو تشدد

مرد اور عورت کو فطرت نے مخصوص وظائف سونپے ہیں اور ان کی بہتر طریقے پر انجام دہی کے لیے انھیں مخصوص اوصاف و خصائص اور صلاحیتوں کا وافر حصہ عطا کیا ہے۔ عورت کا بنیادی کام بچوں کی پیدائش، پرورش و پرداخت، تعلیم و تربیت اور اندرون خانہ حسن انتظام ہے، اس لیے اس کے اندر محبت و رأفت، شفقت و رحمت اور حسن و نزاکت کا دریا موجزن کر دیا گیا ہے اور اسے خلقی طور پر کم زور بنایا گیا ہے۔ مرد کے ذمہ عورت کی حفاظت و کفالت، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی، بھاگ دوڑ، آفاتِ روزگار کا مقابلہ اور بیرونِ خانہ بہت سے کام رکھے گئے ہیں، اس لیے اسے تنومند بنایا گیا ہے اور جسمانی طاقت سے نوازا گیا ہے۔

مظلومیتِ نسواں عہدِ قدیم میں

اس فرق و امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنے کی بنا پر مردوں نے عام طور سے عورتوں کے بنیادی حقوق پامال کیے ہیں، ان کو دبا کر رکھا ہے، ان کا استحصال کیا ہے اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں۔ عورت صدیوں سے مظلوم رہی ہے، دنیا کی تمام تہذیبوں اور معاشروں میں اسے مرد سے کم تر حیثیت دی گئی ہے۔ یونانی اور رومی تہذیب میں اسے دنیا کی تمام آفات و مصائب کی جڑ سمجھا جاتا تھا، ہندو تہذیب میں وہ مرد کی خادمہ اور ضمیمہ تھی، چنانچہ شوہر کا انتقال ہو جاتا تو وہ خود ہی اپنے آپ کو نذرِ آتش کر دیتی تھی، یا اسے زبردستی زندہ جلا دیا جاتا تھا، جیتے جی بھی وہ ہر طرح کے ظلم و تعدی کا شکار رہتی تھی۔ اس کی ناقابلِ رحم حالت کا اندازہ درج ذیل شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ؎

ڈھول گنوار شودر پشو ناری — یہ سب تاڑن کے ادھیکاری

عہدِ جاہلیت میں عربوں کے بعض قبیلوں میں لڑکیاں باعثِ ننگ و عار سمجھی جاتی تھیں، چنانچہ پیدا ہوتے ہی انھیں زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ یہودیت اور عیسائیت عورت کو گناہ کی محرک، بدی کی جڑ، تحریکِ معصیت کا سرچشمہ اور جہنم کا دروازہ قرار دیتی تھیں۔ ان کا نظریہ تھا کہ تمام انسانی مصائب کا آغاز عورت کی ذات سے ہوا ہے اور وہ دنیا والوں پر لعنت اور مصیبت لے کر آئی ہے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر کی بنا پر عورت یورپی ممالک میں، جہاں عیسائیت کو بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا، طویل عرصہ تک اپنے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رہی ہے۔

تحریکِ آزادیٔ نسواں کے ثمرات

یورپ میں بنیادی حقوق (Fundamental Rights) انسانی حقوق (Human Rights) اور مساوی حقوق (Equal Rights) کی تحریکیں چلائی گئیں تو ان کا دائرہ حقوقِ نسواں تک وسیع ہوا۔ پہلے عورتیں تمام حقوق سے محروم تھیں، انھیں مردوں کا زیردست اور محکوم سمجھا جاتا تھا۔ وہ تعلیم سے بے بہرہ رکھی جاتی تھیں، حتیٰ کہ بعض حلقے ان کی انسانیت میں بھی متردد تھے۔ ان تحریکات کے نتیجے میں انھیں پہلے تعلیم کا حق حاصل ہوا۔ انھوں نے ابتدائی، ثانوی پھر اعلیٰ اور طبّی و صنعتی تعلیم حاصل کی۔ پھر انھیں دیگر سماجی، قانونی اور سیاسی حقوق حاصل ہوئے۔

تحریکِ آزادیٔ نسواں کے علم برداروں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عورتیں زندگی کی دوڑ میں مردوں کے مساوی ہیں، لہٰذا انھیں بھی تمام میدانوں میں مردوں کے مساوی حقوق ملنے چاہیے، جوں جوں عورتوں میں خودشناسی کا احساس پیدا ہوا اسی اعتبار سے تحریکِ نسواں میں شدت پیدا ہوتی گئی اور اس کے مطالبات کی فہرست طویل سے طویل تر ہوتی گئی۔ ہر طرح کی آزادی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ تعلیم نے انھیں معاشی طور پر خود کفیل بنایا اور انھیں ملازمت کے مواقع حاصل ہوئے۔ کہا گیا کہ ان کا کام محض شوہروں کی خدمت، بچوں کی پرورش اور گھروں کی دیکھ بھال نہیں ہے۔ ملازمتوں نے مردوں پر ان کا انحصار کم سے کم کیا اور ان میں یہ احساس پیدا کیا کہ نظامِ خاندان میں وہ مجبورِ محض اور مردوں کی دستِ نگر نہیں ہیں۔

عورت پھر بھی مظلوم رہی

ان نسائی تحریکات کے نتیجے میں یوں تو عورت کو بہ ظاہر بہت سے حقوق مل گئے، لیکن نظام خاندان بری طرح انتشار و پراگندگی کا شکار ہوا۔ نکاح کے ادارے (Institution) کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں، بدکاری اور آوارگی کو فروغ ملا۔ نسلِ انسانی کے استمرار و دوام کے لیے مرد و عورت کا جنسی تعلق ضروری تھا۔ اسے نکاح کے مقدس رشتہ سے منضبط کیا گیا تھا۔ آزادیٔ نسواں کے نتیجے میں اب اس کی ضرورت نہ رہی۔ عورت کو اختیار مل گیا کہ وہ کسی بھی مرد کے ساتھ، جب تک چاہے، بغیر نکاح کے، رہ سکتی ہے، اور جب چاہے اس سے علیٰحدگی حاصل کر سکتی ہے۔ نکاح کا مقصد زوجین کے جنسی جذبہ کی تسکین اور اولاد کا حصول تھا۔ اب عورت اس کی پابند نہ رہی۔ اس کی مرضی کے بغیر اب نہ شوہر اس سے جنسی حظ حاصل کر سکتا تھا اور نہ اولاد کے حصول کی خواہش کر سکتا تھا۔ ولادت و رضاعت اور گھر کی دیکھ بھال میں مصروف رہنے کی وجہ سے اب تک وہ کمانے اور وسائل زندگی فراہم کرنے کی فکر سے آزاد تھی اور اسے تحفظ فراہم کرنے اور اس کے لیے اسباب معیشت اکٹھا کرنے کی ذمہ داری مرد پر تھی۔ اب وہ اپنی مالک آپ بن گئی۔ مرد کا اس پر تسلط اور اس کا مرد پر انحصار ختم ہو گیا۔ چنانچہ اب مرد کو اتنا بھی حق نہ رہا کہ وہ عورت سے کوئی ایسی بات کہہ سکے جو اس کے طبع نازک پر گراں گزرے۔ عورت میں یہ احساس بیدار ہو گیا کہ جب اس کے اور مرد کے تمام حقوق مساوی اور یکساں ہیں تو وہ مرد کی برتری اور بالادستی کیوں تسلیم کرے۔

تحریک آزادیٔ نسواں سے عورتوں کو اگرچہ بعض فوائد حاصل ہوئے ہیں، لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس نے مردوں اور عورتوں کو مد مقابل لا کھڑا کیا۔ نظام خاندان میں دونوں کی حیثیت رفیق (Partner) اور حلیف (ally) کی تھی اور دونوں کو مل کر تمدن کی گاڑی کھینچنی تھی۔ اسی بنا پر فطرت کی طرف سے دونوں میں ایک دوسرے سے محبت، ہمدردی، اپنائیت اور غم گساری کے جذبات ودیعت کیے گئے تھے۔ تحریک آزادیٔ نسواں نے دونوں کو فریق (Party) اور حریف (Rival) بنا دیا اور اپنے لیے زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کرنا

اور دوسرے کے جائز حقوق کو بھی تسلیم نہ کرنا اس تحریک کا مطمح نظر بن گیا۔

پھر جب مرد اور عورت دونوں فریق بن گئے تو مرد اپنے حقوق حاصل کرنے اور عورت پر اپنا تسلط جمانے میں پیچھے کیوں رہتے۔ اس کے لیے اس نے اپنے دست وبازو کو بھی استعمال کیا۔ گھر کی چار دیواری میں یوں بھی باہر کے لوگوں کا زور نہیں چلتا، عملاً اقتدار مرد کو حاصل رہتا ہے، چنانچہ مرد نے اپنے اس اقتدار کا خوب خوب استعمال کیا۔ عورت جب زبانی تنبیہ و سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے اس کے قابو میں نہیں آئی تو اس نے زور بازو کا استعمال شروع کر دیا۔ مار کھانا عورت کا مقدر ٹھہرا۔ عہد قدیم میں بھی وہ مرد کی جانب سے جسمانی اذیتوں کا شکار تھی اور عہد جدید میں بھی اس کے حقوق کی طویل فہرست بن جانے کے باوجود اسے اذیتوں سے راحت نہ مل سکی۔

گھریلو تشدد: عالمی صورت حال

حقوق نسواں کے علم برداروں نے اس صورت حال کا جائزہ لینے، اس میں سدھار پیدا کرنے اور عورت کو اس سے نجات دلانے کے لیے ایک خاص اصطلاح وضع کی ہے۔ اور وہ ہے ’گھریلو تشدد‘ (Domestic Violence)۔ اس سے وہ کیا مراد لیتے ہیں؟ اس کا اندازہ اس کی تعریف سے کیا جاسکتا ہے۔ امریکہ کے ایک سرکاری ادارے U.S. Office on Violence against Women نے گھریلو تشدد کی یہ تعریف کی ہے:

> "Pattern of abusive behavior in any relationship that is used by one partner to gain or maintain power and control over another intimate partner" (۱)
>
> ”دو قریبی افراد (یعنی مرد و عورت)، جو کسی بھی رشتہ میں منسلک ہوں، ان میں سے ایک کی جانب سے بدسلوکی کا رویہ، جو وہ دوسرے کے مقابلے میں طاقت اور اس پر کنٹرول حاصل کرنے یا برقرار رکھنے کے لیے ظاہر کرے۔“

الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہی تعریف برطانیہ کے سرکاری ادارے The

---

(1) http://www.usdoj.gov/ovw/domviolence.htm

Children and Family Court Advisory and Support Service کی دستاویز Domestic Violence Assessment Policy میں بھی ملتی ہے۔(1)

اس تعریف کا اطلاق یوں تو ایک ساتھ رہنے والے کسی بھی مرد و عورت پر ہو سکتا ہے، خواہ ان کے مابین کوئی بھی رشتہ ہو، لیکن عموماً اس سے مراد وہ مرد و عورت لیے جاتے ہیں جو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر یا اس کے بغیر میاں بیوی کے طور پر رہتے ہیں۔

گھریلو تشدد کی مختلف صورتیں بتائی گئی ہیں۔ یہ جسمانی (Physical) بھی ہو سکتا ہے کہ فریقین میں سے کوئی دوسرے کو جسمانی طور پر اذیت دے، اسے مارے پیٹے، جس سے اس کا بدن زخمی ہو جائے، جنسی (Sexual) بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر بہ جبر اس سے جنسی تعلق قائم کرے۔ مالی (Financial) بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کمائے دوسرا فریق اس پر قبضہ کر لے اور اسے اپنی مرضی سے خرچ نہ کرنے دے۔ سماجی (Social) بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے سے حقیر سمجھے اور دوسروں کے سامنے اسے ذلیل کرے۔ جذباتی (Emotional) بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا کام کرے جس سے دوسرے فریق کے جذبات مشتعل ہوں، اسے غصہ آئے یا وہ رنج و غم میں مبتلا ہو، نفسیاتی (Psychological) بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ڈرائے دھمکائے، یا اپنی باتوں سے اسے اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کرے۔ یہ تمام صورتیں گھریلو تشدد کے دائرے میں آتی ہیں۔

سماجی طور پر دیکھیں تو موجودہ دنیا کا سب سے گمبھیر مسئلہ گھریلو تشدد ہے۔ کوئی ملک اس سے محفوظ نہیں۔ تمام سماجوں، نسلوں اور طبقات میں یہ عام ہے۔ ۱۹۹۹ء میں ۳۵ ممالک میں کرائے گئے سروے سے واضح ہوا تھا کہ ۵۲ فی صد عورتیں زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے intimate partners (یعنی شوہر یا جن کے ساتھ وہ بیویوں کی حیثیت سے رہتی ہیں) کی جانب سے تشدد کا شکار ہوئی تھیں۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو دنیا کی ایک تہائی عورتیں گھریلو تشدد کا شکار ہوتی ہیں۔ World Health Organisation کی ایک رپورٹ بتاتی ہے کہ

---

(1) http://www.cafcass.gov.uk/English/publications/ consultations/ 04 Dec DV%20 policy.pdf

پوری دنیا میں مقتول ہونے والی عورتوں میں سے چالیس فی صد ایسی ہوتی ہیں جن کے قتل کرنے والے ان کے شوہر یا بوائے فرینڈ ہوتے ہیں۔ World Bank کی ایک رپورٹ میں عورتوں کے اسباب موت میں گھریلو تشدد کو کینسر کی طرح خطرناک قرار دیا گیا ہے۔

اس منظر پر اقوام متحدہ کے ایک نمائندہ Yakin Erturk (Special rapporteur on violence against women نے یوں روشنی ڈالی ہے:

> "Violence against women is a universal phenomenon that persist in all countries of the world, and the perpetrators of that violence are often wellknown to their victims" (1)
>
> ”عورتوں کے خلاف تشدد ایک عالمی مظہر ہے جو دنیا کے تمام ممالک میں پایا جاتا ہے۔ اس تشدد کا ارتکاب کرنے والے عام طور سے ان مظلومین کے نزدیک معروف ہوتے ہیں۔“

صورت حال کے جائزے اور تدارک کے لیے عالمی کوششیں

گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی سے نسائی تحریکات کی جانب سے عورتوں کے خلاف گھریلو تشدد کے مسئلے پر توجہ دی گئی اور اسے ایک عالمی مسئلہ کی حیثیت سے ابھار کر پیش کیا گیا۔ اقوام متحدہ نے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس سے متعلق مختلف قرار دادیں منظور کیں اور ممبر ممالک کو ان کا پابند کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۹۲ء میں UN Commission on the Status of Women نے ایک اسپیشل ورکنگ گروپ بنایا اور اسے اختیار دیا کہ وہ 'عورتوں کے خلاف تشدد پر اعلامیہ' (Decleration on Violence against Women) کا ایک ڈرافٹ تیار کرے۔

۱۹۹۳ء میں UN Commission for Human Rights نے ایک

---

(1) Foreword on WHO Multi-Country study on women's health and domestic violence against women

قرارداد منظور کی، جس میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور تشدد کی تمام شکلوں، خاص طور پر خواتین کے خلاف تشدد کی مذمت کی گئی تھی۔

اسی سال ویانا میں حقوقِ انسانی پر بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں عورتوں کے خلاف تشدد کا خاتمہ کرنے کے لیے جامع منصوبہ بندی کی گئی۔ اس موقع پر ایک اعلامیہ منظور کیا گیا جسے 'عورتوں کے خلاف تشدد کے خاتمہ کا اعلامیۂ (Decleration on the Elimination of Violence against Women) کا نام دیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اقوامِ متحدہ اور اس کے ممبر ممالک پبلک لائف اور پرائیوٹ لائف دونوں سے عورتوں کے خلاف تشدد، جنسی ایذا رسانی اور نظامِ عدل میں صنفی تفریق کے خاتمے کے لیے کام کریں گے۔ یہ اعلامیہ بین الاقوامی سطح پر حقوقِ انسانی کی پہلی دستاویز تھا، جس میں گھریلو تشدد کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اس میں زور دے کر یہ بات کہی گئی تھی کہ گھریلو تشدد عورت کے انسانی حقوق اور اس کو حاصل بنیادی آزادی کے خلاف ہے۔

۱۹۹۴ء میں UN Commission for Human Rights نے ایک قرارداد منظور کی کہ ایک اسپیشل rapporteur کا تقرر کیا جائے جو گھریلو تشدد کے اسباب و عواقب کا جائزہ لے۔ اس کا کام یہ طے کیا گیا کہ وہ جامع طور سے بین الاقوامی سطح پر عورتوں کے خلاف تشدد کے اعداد و شمار جمع کرکے ان کا تجزیہ کرے اور تشدد روکنے کی تدابیر بتائے۔

۱۹۹۵ء میں بیجنگ (چین) میں 4th World Conference on Women منعقد ہوئی۔ اس میں عورتوں کے خلاف تشدد کو ایک نازک اور سنگین مسئلہ قرار دیا گیا، جو فوری توجہ کا متقاضی ہے۔ اس وقت کے اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل بطرس غالی (Boutros-Ghali) نے صورتِ حال کی سنگینی کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا تھا: "عورتوں کے خلاف تشدد ایک عالمی مسئلہ ہے جو مسلسل بڑھ رہا ہے"۔ اس موقع پر تشدد روکنے کے لیے platform for action تجویز کیا گیا۔

۱۹۹۶ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے UN Trust Fund قائم کیا، جس کا مقصد عورتوں کے خلاف تشدد روکنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنا تھا۔

دس ممالک میں اقوام متحدہ کا سروے

۱۹۹۷ء میں اقوام متحدہ نے عورتوں کے خلاف تشدد کے سلسلے میں دنیا کے دس ممالک کا سروے کرایا۔ اس سروے کی رپورٹ The WHO Multi-country Study on Women's Health and Domestic Violence against Women کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ نے عالمی سطح پر عورتوں کے خلاف گھریلو تشدد کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کا خلاصہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس سروے کا مقصد یہ جائزہ لینا تھا کہ عورتوں پر ان کے Intimate Partner کی جانب سے کتنا تشدد ہوتا ہے اور اس کا ان کی صحت پر کتنا اثر پڑتا ہے؟ سروے میں جن ممالک کو شامل کیا گیا ان کے نام یہ ہیں: (۱) بنگلا دیش (۲) برازیل (۳) ایتھوپیا (۴) جاپان (۵) نامیبیا (۶) پیرو (۷) سموا (۸) سربیا و مونٹے نیگرو (۹) تھائی لینڈ (۱۰) تنزانیا۔ سروے کے لیے انہی ممالک کو کیوں منتخب کیا گیا؟ اس کی وجہ رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ وہاں عورتوں کے خلاف تشدد کے اعداد و شمار پہلے موجود نہیں تھے اور مقامی طور پر وہاں ایسے تشدد مخالف گروپ (Anti-Violence groups) سرگرم تھے جو یہ اعداد و شمار صورت حال کی بہتری اور تشدد کی روک تھام کے لیے استعمال کر سکتے تھے، نیز وہاں ایسا سیاسی ماحول بھی پایا جاتا تھا جو اس مسئلہ سے بہ خوبی نمٹ سکتا تھا۔

ان دس ممالک کے پندرہ مقامات پر چوبیس ہزار عورتوں سے تشدد کی مختلف صورتوں (جسمانی، جنسی، نفسیاتی وغیرہ) سے متعلق سوالات کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ زیر سروے تمام ممالک میں گھریلو تشدد وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اس کا تناسب سب سے کم (۱۵٪) جاپان میں اور سب سے زیادہ (۷۱٪) بنگلا دیش، ایتھوپیا، پیرو اور تنزانیا میں ہے۔ زیادہ تر علاقوں میں تشدد کا تناسب ۲۹ سے ۶۲ فی صد کے درمیان تھا۔ جسمانی تشدد میں تھپڑ مارنا، کوئی چیز پھینک کر زخمی کر دینا، لات گھونسہ مارنا، ڈنڈے سے پٹائی کرنا اور بندوق یا کسی دوسرے ہتھیار سے نقصان پہنچانا، جنسی تشدد میں عورت کی مرضی کے علی الرغم یا اسے خوف

زدہ کر کے جنسی تعلق قائم کرنا، نفسیاتی تشدد میں تذلیل و تحقیر کرنا اور ڈرانا دھمکانا شامل ہے۔ سروے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عموماً ۱۵ سے ۱۹ سال کی عورتیں جسمانی اور جنسی تشدد کا زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ تشدد سے عورتوں کی صحت پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کے اعضائے بدن پر خراشیں اور چوٹیں آتی ہیں، آنکھ، ناک، کان زخمی ہو جاتے ہیں، ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ زیادہ تر عورتوں کو دوران حمل بھی پیٹا گیا، جس کے نتیجے میں ان کی دماغی صحت بھی متاثر ہوئی، چنانچہ ان میں سے بہت سوں نے مار کھانے کے بعد خودکشی کا ارادہ کیا۔

اس سروے کا خلاصہ عورتوں کے خلاف تشدد کے اسپیشل رپورٹر Yakin Erturk کے الفاظ میں یہ ہے:

> "This study challenges the perception that home in a safe haven for women by showing that women are more at risk of experiencing violence in intimate relationship than any where else." (1)
>
> ”یہ مطالعہ اس گمان کو چیلنج کرتا ہے کہ گھر عورتوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ ہے۔ اس لیے کہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے دوسروں کی بہ نسبت اپنے قریب ترین رشتہ داروں کی جانب سے تشدد کا زیادہ خطرہ رہتا ہے“۔

دیگر ممالک کا جائزہ

یہ محض گنتی کے چند ملکوں کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ دنیا کے تمام ممالک اس تشویش ناک صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ ان میں وہ ممالک بھی ہیں جن کے باشندوں کا تہذیبی و سماجی شعور زیادہ بلند نہیں ہے اور وہ ممالک بھی ہیں جنھیں عصر حاضر میں تہذیب و تمدن کا امام سمجھا جاتا ہے۔ ہر جگہ عورتیں بری طرح ظلم و تشدد کا شکار ہیں اور ان پر ظلم ڈھانے والے کوئی اور نہیں ان

---

(1) Foreword on WHO Multi-Country study on women's health and domestic violence against women

کے شوہر، سابق شوہر، بوائے فرینڈ یا دیگر قریبی افراد ہیں۔

۲۰۰۲ء میں WHO کی ایک رپورٹ کے مطابق آسٹریلیا، کینیڈا، اسرائیل، جنوبی افریقہ اور امریکہ میں کیے گئے مطالعات سے معلوم ہوا کہ مقتول عورتوں کی ۴۰ سے ۷۰ فی صد تعداد ان عورتوں کی تھی جو اپنے intimate partners کے ذریعے قتل کی گئیں۔

بعض سروے رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عورتیں اپنے گھروں میں قریبی افراد مثلاً شوہروں کے ذریعہ تشدد کا شکار ہوتی ہیں ان کا تناسب سویڈن میں ۷۰ فی صد، جارجیا میں ۵۰ فی صد، ڈومینیکین ریپبلک (Dominican) میں ۴۸ فی صد، بوٹسوانا (Botswana) میں ۶۰ فی صد، بارباڈوس (Barbados) میں ۳۰ فی صد، مصر میں ۳۴ فی صد اور نیوزی لینڈ میں ۳۵ فی صد ہے۔

یورپی ممالک میں گھریلو تشدد کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر ۲۰۰۲ء میں کونسل آف یورپ نے گھریلو تشدد کو پبلک ہیلتھ ایمرجنسی ڈکلیر کر دیا۔

پوری دنیا میں گھریلو تشدد کے جتنے واقعات رپورٹ ہوتے ہیں، ان میں سے ایک تہائی تعداد امریکہ اور برطانیہ کی ہوتی ہے۔ ۲۰۰۰ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق امریکہ میں ہر سال تقریباً ۱۳؍ لاکھ عورتیں اپنے قریبی رفقاء intimate partners کے ذریعے جسمانی تشدد اور ایذا رسانی کا شکار ہوتی ہیں۔(۱) ۲۰۰۰ء میں جتنی عورتیں اسلحہ کے ذریعے قتل کی گئیں ان کی دو تہائی تعداد ان عورتوں کی تھی جنھیں قتل کرنے والے ان کے intimate partners تھے۔ U.S. Department of Justice کے مطابق ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۲ء کے درمیان فیملی ممبرس کے خلاف تشدد کے ۳۵؍ لاکھ واقعات رپورٹ کیے گئے۔ ان میں سے ۴۹ فی صد واقعات زوجین (Spouses) کے خلاف تشدد کے تھے اور ان میں بھی ۸۴ فی صد تعداد عورتوں کی تھی جو مردوں کے ہاتھوں تشدد اور بدسلوکی کا شکار ہوئی تھیں۔ اپنے جوڑے کے ساتھ بدسلوکی کے الزام میں جو لوگ جیل میں بند تھے ان میں سے ۵۰ فی صد دو

---

(1) National violance against women survay (2000) available at http://www.ojp.usdoj.gov/nij/pubs-sum/183781.htm

لوگ تھے جنھوں نے اپنے جوڑے کو قتل کر دیا تھا اور مقتول ہونے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی(۱)۔

۱۹۹۲ء کی ایک رپورٹ کے مطابق انگلینڈ میں گھریلو تشدد کا شکار ہونے والی عورتوں کا تناسب ۲۵ فی صد تھا(۲) پولیس کو رپورٹ ہونے والے Violence Crimes میں سے ۲۵ فی صد سے زائد گھریلو تشدد سے متعلق ہوتے ہیں۔ مقتول ہونے والی عورتوں میں سے ۴۰ سے ۴۵ فی صد وہ عورتیں ہوتی ہیں جنھیں قتل کرنے والے ان کے Male partners ہوتے ہیں(۳)۔ ماضی قریب کی ایک رپورٹ کے مطابق انگلینڈ اور Wales میں ہر ہفتہ دو عورتیں موجودہ یا سابق Male Partners کے ذریعے ہلاک کر دی جاتی ہیں۔ اور ہر منٹ میں گھریلو تشدد کا ایک کیس رپورٹ کیا جاتا ہے(۴)۔ اسکاٹ لینڈ میں ۲۰۰۶ سے ۲۰۰۷ء میں گھریلو تشدد کے تقریباً ۴۹ ہزار کیس درج کیے گئے۔ ان میں سے ۸۷ فی صد کیس ایسے تھے جن میں عورتیں ظلم و تشدد کا شکار بنی تھیں اور ان میں بھی ۹۰ فی صد واقعات متاثرہ عورتوں کے گھر میں پیش آتے تھے۔

برصغیر کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ Human Rights Watch کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ۹۰ فی صد عورتیں اپنے گھروں میں جسمانی، جنسی اور نفسیاتی تشدد کا شکار بنتی ہیں۔ Human Rights Commission of Pakistan کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۳ء میں صوبہ پنجاب میں گھریلو تشدد کے ۴۰۰ کیس ریکارڈ کیے گئے، جن میں سے نصف بیویوں کے قتل کے تھے۔

UN Population Fund کی ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ۷۰ فی صد شادی شدہ عورتیں ۱۵ سے ۴۹ سال کی عمر میں گھریلو تشدد کا شکار بنتی ہیں، ان کی پٹائی کی جاتی ہے

---

(1) US Dept. of Justice NCJ 207846, Bureau of Justice statistics, Family Violence Statistics: including statistics on strangers and Acquaintance, at 31-32 (2005) available at: http://www.ojp.usdoj.gov/bjs/pub/pdf/fvs.pdf

(2) Women's Aid Federation [England] Report, 1992

(3) Domestic Violence-Action for Change, G.H- ague & E. Malos 1993

(4) Crime in England and Wales 2006/2007 report

اور ان کے ساتھ بہ جبر جنسی تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں روزانہ ۱۴ عورتیں اپنے شوہروں کے ہاتھوں موت کا شکار ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے National Crime Record Bureau سے معلوم ہوتا ہے کہ پولیس ریکارڈ کے مطابق ہر تین منٹ میں ایک عورت سے ارتکاب جرم ہوتا ہے اور ہر چھ گھنٹے میں ایک شادی شدہ عورت کی، پٹائی سے موت ہو جاتی ہے، یا اسے زندہ جلا دیا جاتا، یا خودکشی پر مجبور کیا جاتا ہے۔

گھریلو تشدد کی روک تھام کے لیے عصری قوانین

گھریلو تشدد کی اس انتہائی سنگین صورت حال نے سماجی مصلحین، سیاسی زعماء، قانون بنانے والی شخصیات اور اسے نافذ کرنے والے اداروں سب کو پریشان کر رکھا ہے اور وہ اس کے تدارک کے لیے جی جان سے لگے ہوئے ہیں۔

۱۹۹۹ء سے ہر سال اقوام متحدہ کی جانب سے ۲۵ نومبر کو عورتوں کے خلاف تشدد کے خاتمہ کے بین الاقوامی دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، جس میں اس معاملے میں بیداری لانے اور گھریلو تشدد کی روک تھام کے لیے مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔

اقوام متحدہ کی جانب سے اس موضوع پر عالمی سطح کی کئی کانفرنسیں منعقد ہوئی ہیں، متعدد اعلامیے منظور کیے گئے ہیں اور ممبر ممالک کو عورتوں کے خلاف تشدد روکنے کے لیے قوانین بنانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس میدان میں اب تک کتنی پیش رفت ہوئی ہے اس کا اندازہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی ایک رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ۲۰۰۶ء میں In-Depth Study on All Forms of Violence against Women کے عنوان سے پیش کی تھی۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ۸۹ ممالک نے عورتوں کے خلاف تشدد کے سلسلے میں Lagislative Provisions بنائے ہیں، ان میں سے ۶۰ ممالک ایسے ہیں جنھوں نے Special Domestic violence Laws وضع کیے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے ممالک نے گھریلو تشدد ختم کرنے کے لیے National Plan of Action تیار کیے ہیں۔ یہ صورت حال ۲۰۰۳ء کے مقابلے میں بہتر ہے، جب UNIFEM نے

Anti-Violence Lagislation کا ایک Scan تیار کیا تھا تو اس سے معلوم ہوا تھا کہ صرف ۳۵ ملکوں نے گھریلو تشدد کے سلسلے میں خصوصی قوانین بنائے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل گھریلو تشدد روکنے کے لیے ہندوستان میں ایک قانون منظور کیا گیا ہے۔ اس کا نام ہے: The Protection of Women from Domestic Violence Act 2005۔ یوں تو ایک دہائی قبل سے اس پر کام ہو رہا تھا۔ ۱۹۹۲ء میں ہندوستانی وکلاء نے گھریلو تشدد کے موضوع پر ایک ابتدائی ڈرافٹ تیار کیا تھا، پھر ۱۹۹۴ء میں National Commission for Women (NCW) نے ایک بل تیار کیا۔ بعد میں ہندوستانی وکلاء نے نسائی تحریکات کے رہنماؤں کی مشاورت سے ۱۹۹۹ء میں ایک دوسرا بل تیار کیا۔ حکومت ہند نے ۲۰۰۱ء میں پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا جس کا نام The Protection from Domestic Violence Bill 2001 تھا۔ کئی بار کی بحث و تمحیص اور نظرثانی کے بعد اگست ۲۰۰۵ء میں اسے پارلیمنٹ نے منظور کیا، ستمبر ۲۰۰۵ء میں صدر جمہوریہ نے اس پر دستخط کیے اور ۲۶/ اکتوبر ۲۰۰۶ء سے ایکٹ کی صورت میں اس کا نفاذ ہوا۔

اس قانون کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ اس کے دائرہ میں تشدد کی تمام صورتوں (زبانی، جسمانی، جنسی، نفسیاتی، معاشی وغیرہ) کو شامل کیا گیا ہے۔ تشدد کی ہر وہ صورت، جس سے عورت کو جسمانی یا نفسیاتی طور پر اذیت پہنچے یا اس کی صحت یا زندگی کو خطرہ لاحق ہو، اس میں شامل ہے۔

۲۔ اس سے فائدہ اٹھانے کا حق صرف بیوی ہی کو نہیں، بلکہ اس عورت کو بھی ہوگا جو غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود کسی مرد کے ساتھ رہتی ہو اور اس سے اس کا جنسی تعلق ہو۔

۳۔ نہ صرف شوہر یا Male Partner بلکہ اس کے قریبی رشتہ داروں: ماں، بہن وغیرہ کے خلاف بھی کیس فائل کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ صرف مظلومہ ہی نہیں، بلکہ اس کا پڑوسی، رشتہ دار یا کوئی بھی سماجی کارکن اس کی طرف سے کیس درج کرا سکتا ہے۔

۵۔ مظلومہ اپنے Partner کے جس گھر میں رہتی ہے، عدالت اس کا ایک حصہ اس کے استعمال کے لیے خاص کر دے گی اور ملزم کو نہ صرف یہ کہ اس الاٹ شدہ حصہ میں جانے کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ مظلومہ سے زبانی، تحریری، فون یا ای میل سے کسی طرح کا رابطہ کرنا اس کے لیے ممنوع ہوگا۔

۶۔ مجسٹریٹ نہ صرف یہ کہ مظلومہ کے گزارہ کے لیے ماہانہ ایک رقم متعین کر دے گا، جس کی ادائیگی ملزم کے ذمے ہوگی، بلکہ تشدد کے نتیجے میں مظلومہ کو پہنچنے والی جراحت، خواہ وہ جسمانی ہو یا نفسیاتی، اس کا ہرجانہ بھی ملزم پر عائد کرے گا۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

مذکورہ قانون کی تفصیلات سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گھریلو تشدد کی روک تھام کے لیے اس میں کتنی سختی رکھی گئی ہے۔ لیکن کیا یہ عورت کے درد کا درماں بن سکا۔ اس سے پراپرٹی کی مالک upper class کی بعض عورتوں کا تو فائدہ اٹھانا ممکن ہوا کہ وہ اپنے شوہروں پر جھوٹے سچے الزامات لگا کر انھیں پریشان کرتی رہیں(۱) اور نسائی تحریکات کے ان علم برداروں کی بھی باچھیں کھل گئیں جو عورت کی مظلومیت کا تمام تر ذمہ دار مرد اور اس کے خاندان والوں کو سمجھتے ہیں، لیکن عام عورتوں کی غالب اکثریت کو اس سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ وہ اب بھی تشدد کا شکار ہیں۔ یہی حال دوسرے ممالک کا بھی ہے، کہ وہاں تشدد روکنے کی ہزار ہا کوششوں کے

---

(۱) اس قانون کے غلط استعمال سے مردوں کی ایک بڑی تعداد پریشان ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شوہروں کے حقوق کی حفاظت کرنے اور انھیں گھریلو تشدد سے بچانے کے لیے بعض تحریکات، جن میں Save Faimly Foundation اور My Nation قابل ذکر ہیں، سرگرم ہوگئی ہیں۔ شوہروں کے خلاف تشدد کے موضوع پر ایک سروے بھی کرایا گیا ہے جس سے کھل کر یہ بات سامنے آئی ہے کہ ۲۰ سے ۳۲ فی صد شوہر اپنی بیویوں کی جانب سے ہر طرح کے تشدد کا شکار ہیں۔ اس سروے کی تفصیلات کے لیے رجوع کیجیے:

http://498a.wordpress.com, http://victims-of-law.blogspot.com

باوجود اس میں کامیابی نہیں مل رہی ہے۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ۱۳ر اکتوبر ۲۰۰۹ء کو پیش کی گئی اقوام متحدہ کی ایک حالیہ رپورٹ سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے:

> "Despite efforts by governments and campaigns carried out by international organizations, violence against women continued on a wide scale in both developed and developing countries" (۱)
>
> ”حکومتوں کی کوششوں اور بین الاقوامی تنظیموں کی مہمات کے باوجود عورتوں کے خلاف تشدد ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں طرح کے ملکوں میں بڑے پیمانے پر برابر جاری ہے۔“

غلط تشخیص، غلط علاج

گھریلو تشدد روکنے کے لیے بین الاقوامی سطح پر کی جانے والی کوششوں، حکومتوں کی مساعی اور نسائی تحریکات کی مہمات کے باوجود اس میں کمی نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ مسئلہ کی غلط تشخیص کی گئی اور مرض کا غلط طریقے سے علاج کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ خیال کیا گیا کہ عورتوں کی مظلومیت کا سبب انھیں مردوں کے مساوی اور ان کے جیسے حقوق حاصل نہ ہونا ہے، چنانچہ تحریکیں چلا کر انھیں بھی وہ تمام حقوق دلا دیے گئے جن سے مرد بہرہ ور تھے۔ یہ خیال کیا گیا کہ ان کی مظلومیت کا سبب ان پر بے جا پابندیاں اور آزادی سے محرومی ہے، چنانچہ ان کے لیے ہر طرح کی آزادی کی وکالت کی گئی اور انھیں یہ حق دلایا گیا کہ وہ اپنی مرضی کی آپ مالک ہیں، کوئی، حتیٰ کہ ان کے شوہر بھی ان پر اپنی مرضی نہیں تھوپ سکتے۔ یہ خیال کیا گیا کہ ان کی مظلومیت کا سبب مالی اعتبار سے مردوں پر ان کا انحصار ہے، چنانچہ ملازمتوں کے دروازے ان پر کھول دیے گئے اور انھیں خود کفیل بنا دیا گیا۔ حالاں کہ یہ تمام خیالات بے بنیاد اور غلط تجزیہ پر مبنی تھے۔ چنانچہ صحیح تشخیص اور صحیح علاج نہ ہونے کی بنا پر مرض میں نہ صرف یہ کہ کوئی افاقہ نہیں ہے، بلکہ اس کی شدت اور خطرناکی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

---

(1) UN Report, 13th Oct.2009 (Press Trust of India

گھریلو تشدد روکنے کے لیے اسلام کی تدابیر

گھریلو تشدد کے مسئلہ کو اسلام نے بہت خوب صورتی سے حل کیا ہے۔ اس نے خاندانی نظام کو جن خطوط پر استوار کیا ہے اور اسے صحیح طریقے پر چلانے کے لیے جو تعلیمات و ہدایات دی ہیں ان پر کما حقہ عمل کیا جائے تو گھر جنت نظیر بن جاتا ہے اور ایک خاندان میں رہنے والے تمام افراد ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ کسی کو اپنی حق تلفی کا احساس ہوتا ہے نہ کسی کو دوسرے پر بے جا تشدد کرنے کا موقع ملتا ہے۔ سطور ذیل میں اسلام کی ان تعلیمات اور اقدار کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو گھریلو تشدد کو روکنے میں معاون بنتی ہیں:

(۱) مرد اور عورت رفیق ہیں نہ کہ فریق:

اسلام نے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا حریف اور مد مقابل نہیں، بلکہ رفیق اور ہمدرد بنایا ہے، جو ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کرتے اور باہم مل جل کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبۃ:۷۱)

”مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔“

اس نے نظامِ خاندان میں زوجین کو ایک دوسرے کے لیے باعث سکون قرار دیا ہے اور باہم محبت اور رحم و کرم کرنے کی تاکید کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا
وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ (الروم:۲۱)

”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔“

(۲) حقوق میں مساوات اور فطری تقسیم کار

اسلام نے مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات کا اعلان کیا اور زندگی کے مختلف

میدانوں میں عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق عطا کیے، لیکن ان کے حقوق میں مساوات کا مطلب ان کے کاموں کی یکسانیت نہیں ہے۔ اس نے دونوں کے دائرۂ کار الگ الگ رکھے اور ان کی فطری صلاحیتوں کی رعایت کرتے ہوئے منصفانہ طور پر ان کے کام تقسیم کیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (البقرۃ: ۲۲۸)

”اور عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔“

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الرجل راع علی أھل بیتہ وھو مسئول عن رعیتہ والمرأۃ راعیۃ علی أھل بیت زوجھا وولدہ وھی مسئولۃ عنھم۔(۱)

”مرد اپنے گھر والوں کا راعی (نگراں) ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور بچوں کی راعیہ (نگراں) ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“

(۳) مرد کی ذمہ داری خاندان کی حفاظت اور نگرانی

زوجین کے مساوی حقوق کی وضاحت اور فرائض کی تعیین کے ساتھ اسلام نے مرد پر ایک اضافی ذمہ داری یہ عائد کی کہ وہ خاندان کی سربراہی کرے۔ کسی بھی ادارے کا نظم بہتر طریقے پر اسی صورت میں چل سکتا ہے جب ایک شخص کو اس کا سربراہ بنایا جائے اور دوسرے افراد پر اس کی اطاعت لازم قرار دی جائے۔ اس ذمہ داری کو قرآن میں ’قوامیت‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۚ (النساء: ۳۴)

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ اطیعوا اللہ...، ۷۱۳۸، و دیگر مقامات، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، ۱۸۲۹

"مرد عورتوں کے قوام (سربراہ) ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں"

لفظ قوام سے کسی اعزاز، غلبہ و تسلط اور حاکمانہ اقتدار و اختیار کا اظہار نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت میں یہ صفت ایک انتظامی ذمہ داری کو ظاہر کرتی ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے:

"قوام یا قیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔" (۱)

(۳) عورت کو شوہر کی اطاعت کی تاکید

دوسری طرف اسلام نے عورتوں کو پابند کیا کہ وہ اپنے شوہروں کی اطاعت کریں اور کسی معاملے میں ان کی حکم عدولی نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ (النساء: ۳۴)

"پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔"

امام فخر الدین رازیؒ (م ۶۰۶ھ) نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"آیت کے اس ٹکڑے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ قانتات کا معنی ہے اللہ کی اطاعت کرنے والیاں اور حافظات للغیب کا مطلب ہے شوہروں کے حقوق ادا کرنے والیاں۔ یہاں پہلے حق اللہ کی ادائی کا تذکرہ کیا گیا، بعد میں شوہر کے حقوق کی ادائی کی بات کہی گئی۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ پورے ٹکڑے میں شوہر کے حقوق کا تذکرہ ہے۔ قانتات کا مطلب یہ ہے کہ وہ شوہروں کی موجودگی میں ان کی اطاعت شعار ہوتی ہیں اور حافظات للغیب کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کی غیر حاضری

---

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ۱/ ۳۴۹۔ اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم کا مقالہ 'مرد کی قوامیت۔ مفہوم اور ذمہ داریاں' شائع شدہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۹ء۔

میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔"(۱)

ذخیرۂ احادیث میں بھی ایسی بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک عورت کا وصف یہ ہے کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے اور اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: کون سی عورت سب سے بہتر ہے؟ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا:

> التی تسرہ اذا نظر، وتطیعہ اذا أمر، ولا تخالفہ فی نفسہا ولا مالہا بما یکرہ۔(۲)
>
> "وہ عورت جس کا شوہر اس کی طرف دیکھے تو خوش ہو جائے، وہ اسے کسی چیز کا حکم دے تو اس پر عمل کرے اور اپنی ذات کے بارے میں یا اس مال کے بارے میں جو اس کی تحویل میں ہے، شوہر کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔"

شوہر کی اطاعت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جب وہ جنسی عمل کی خواہش کا اظہار کرے تو عام حالات میں بیوی اس سے آنا کانی نہ کرے۔ رشتۂ نکاح کی غرض وغایت ہی یہ ہے کہ زوجین جائز حدود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ذریعے جنسی تسکین حاصل کریں۔ متعدد احادیث میں اس کی تلقین کی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> اذا دعا الرجل امرأتہ الی فراشہ فأبت ان تجیئ لعنتہا الملائکۃ حتی تصبح۔(۳)
>
> "اگر مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ آنے سے انکار کردے تو فرشتے اس پر صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔"

---

(۱) فخر الدین الرازی، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، ۱۰/ ۸۰

(۲) سنن نسائی، کتاب النکاح، باب ای النساء خیر، ۳۲۳۱، مسند احمد، ۲/ ۲۵۱

(۳) صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب اذا باتت المرأۃ مہاجرۃ فراش زوجہا، ۵۱۹۳، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم امتناعہا من فراش زوجہا، ۱۴۳۶

حضرت طلق بن علیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا دعا الرجل زوجتہ لحاجتہ فلتأتہ وان کانت علی التنور (۱)

"اگر مرد اپنی بیوی کو اپنی ضرورت سے بلائے تو وہ (فوراً) اس کے پاس چلی جائے، خواہ (اس وقت) تنور پر بیٹھی ہو"۔

(۵) مرد کو بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت

اسلام نے مردوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ وہ ان کی خادمائیں نہیں ہیں کہ ان کو اپنے سے کم تر سمجھیں، ان کی تحقیر و تذلیل کریں یا ان کو جسمانی یا نفسیاتی اذیتیں دیں۔ میاں بیوی دونوں الگ الگ خاندانوں سے آکر ایک خاندان تشکیل دیتے ہیں۔ ان کے درمیان مزاجی فرق عین ممکن ہے، اس لیے اگر بیوی کی کوئی بات یا کوئی رویہ شوہر کو ناگوار کرے تو اس سے نفرت نہ کرنے لگے، بلکہ اس کے ساتھ محبت، شائستگی اور ہمدردی کے ساتھ پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ (النساء:۱۹)

"ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو، مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو"۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

استوصوا بالنساء خیرا (۲)

"عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو"۔

حضر ... ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) جامع الترمذی، ابواب الرضاع، باب ما جاء فی حق الزوج علی المرأۃ: ۱۱۵۹، صححہ الالبانی

(۲) صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب المداراۃ مع النساء: ۵۱۸۶، اور دیگر مقامات، صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء: ۱۴۶۸

لا یفرك مؤمن مؤمنة إن کرہ منها خلقاً رضي منها آخر۔(۱)

"کوئی صاحب ایمان مرد (شوہر) کسی صاحب ایمان عورت (بیوی) سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی خصلت اسے بری لگے گی تو دوسری خصلت اس کے نزدیک پسندیدہ ہوگی۔"

متعدد احادیث میں مردوں کو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور لطف و کرم کے ساتھ پیش آنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

خیرکم خیرکم لأهله وأنا خیرکم لأهلي۔(۲)

"تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں تم میں بہتر ہوں اپنے گھر والوں کے معاملے میں۔"

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أکمل المؤمنین إیماناً أحسنهم خلقاً. وخیارکم خیارکم لنسائهم خلقاً۔(۳)

"اہل ایمان میں کامل ترین ایمان والے وہ ہیں جو اخلاق کے معاملے میں بہتر ہوں اور تم میں بہتر وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ سب سے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کریں۔"

(۶) عورت پر تشدد نہ کرنے کے صریح احکام

اسلام نے بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور ان سے نفرت نہ کرنے کی عمومی ہدایات ہی نہیں دیں، بلکہ صریح احکام کے ذریعے شوہروں کو ان پر ظلم و تشدد کرنے سے روکا۔ اس مضمون کی چند احادیث ملاحظہ ہوں:

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء، ۱۴۶۹

(۲) جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب فضل ازواج النبی، ۳۸۹۵ و رواہ ابن ماجہ فی کتاب النکاح، باب حسن معاشرۃ النساء عن ابن عباس

(۳) جامع الترمذی، ابواب الرضاع، باب ما جاء فی حق المرأۃ علی زوجها، ۱۱۶۲

حضرت عبداللہ بن زمعہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یجلد أحدکم امرأته جلد العبد ثم یجامعها فی آخر الیوم(۱)

”تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح نہ مارے جس طرح غلام کو مارتا ہے، کیوں کہ پھر وہ دن گزرنے کے بعد اس کے ساتھ شب باشی کرے گا۔“

حضرت لقیط بن صبرہؓ بیان کرتے ہیں: ایک موقع پر میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میری بیوی کی زبان ٹھیک نہیں، یعنی وہ بدزبان ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسے طلاق دے دو۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کافی عرصہ میرے ساتھ گزار چکی ہے اور اس سے میرے بچے بھی ہیں۔ فرمایا: اسے سمجھاؤ بجھاؤ، اگر اس میں کچھ بھی خیر ہوگا تو وہ تمھاری مرضی کے کام کرنے لگے گی، اپنی گھر والی کو اس طرح ہرگز نہ مارو جس طرح اپنی لونڈی کو مارتے ہو (ولا تضرب ظعینتك ضربك أميتك)(۲)

ان احادیث میں بیوی کو مارنے کو ناپسندیدہ، غیر مطلوب اور قابل نفرت عمل کی حیثیت سے پیش کرنے کے لیے نفسیاتی تدبیر اختیار کی گئی ہے۔ شیخ رشید رضا (م ۱۳۵۴ھ) نے اس مضمون کی بعض احادیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

> ”یہ احادیث مرد کو یاد دلاتی ہیں کہ اگر وہ جانتا ہے کہ اسے آئندہ ضرور اپنی بیوی سے ملنا اور خاص تعلق قائم کرنا ہے۔ وہ تعلق جو دو انسانوں کے درمیان پایا جانے والا سب سے مضبوط اور محکم تعلق ہوتا ہے اور اس کے ذریعے دونوں کے درمیان مکمل اتحاد ہو جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا تعلق دوسرے سے اس سے زیادہ قوی ہے جتنا اس کے اپنے اعضاء بدن کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ تعلق اور اتحاد و اتفاق محسوس کرتا ہے، جو فطرت کا تقاضا ہے، تو کیوں کر اس کے شایان شان ہے کہ وہ اپنی بیوی کو، جو اسی جیسی ہے، اتنا ذلیل اور بے حیثیت کر دے جتنا اس کا غلام ہوتا ہے کہ وہ اسے اپنے کوڑے یا ہاتھ سے مارے! واقعہ یہ ہے کہ شریف

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ما یکرہ من ضرب النساء، ۵۲۰۴؛ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، ۲۸۵۵

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی الاستنثار، ۱۴۲

اور باعزت مرد کا مزاج ایسی زیادتی کرنے سے بچے گا اور جس عورت کو وہ لونڈی کے درجے میں کر دے اس سے غیر معمولی اتحاد کا مطالبہ کرنے سے اس کی طبیعت ابا کرے گی۔ ان احادیث سے عورتوں کو مارنے کی انتہائی شناعت ظاہر ہوتی ہے۔(۱)

حضرت ایاس بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر مردوں کو تلقین فرمائی: **لا تضربوا إماء الله** (اللہ کی باندیوں، یعنی اپنی عورتوں کو نہ مارو) اسی حدیث میں آگے ہے کہ ایک مرتبہ کئی لوگوں نے اپنی بیویوں کی پٹائی کر دی۔ اگلے دن وہ عورتیں ازواج مطہرات کے گھروں میں اکٹھا ہو کر اپنے شوہروں کی شکایت کرنے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ تک شکایت پہنچی تو آپؐ نے فرمایا:

> **لقد طاف بآل محمد نساء كثير يشكون أزواجهن، ليس أولئك بخياركم.**(۲)
>
> "محمد ﷺ کے گھر والوں کے پاس بہت سی عورتوں نے چکر لگائے ہیں اور اپنے شوہروں کی شکایت کی ہے۔ یہ لوگ تم میں سے اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

(۷) بے جا تشدد پر شوہر کی تعزیر ہوگی

اس سے بڑھ کر اسلامی شریعت نے یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ اگر کوئی مرد مذکورہ اسلامی تعلیمات کو پامال کرتا ہے اور اپنی بیوی کو ناحق ستاتا، اس کے ساتھ مار پیٹ کرتا اور اذیتیں دیتا ہے تو عورت کو حق ہے کہ وہ اسلامی عدالت سے فریاد کرے اور قاضی پر لازم ہے کہ اس کی شکایت درست پائے تو مرد کو تعزیری سزا دے۔

الموسوعۃ الفقہیۃ میں ہے:

> "فقہاء نے کہا ہے کہ شوہر اگر اپنی بیوی پر ظلم و زیادتی کرے تو حاکم یا قاضی اسے اس سے روکے گا۔ جمہور فقہاء نے صراحت کی ہے کہ قاضی یا حاکم اس پر شوہر کو سزا دے

---

(۱) رشید رضا، تفسیر المنار: ۵/ ۷۵-۷۶

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی ضرب النساء، ۲۱۴۶، سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب ضرب النساء، ۱۹۸۵، سنن الدارمی، کتاب النکاح، باب فی النہی عن ضرب النساء، ۲۲۱۹

سکتا ہے۔"(۱)

اگر ان تعلیمات و ہدایات پر صحیح طریقے سے عمل کیا جائے تو گھریلو تشدد کو آسانی سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ جن معاشروں میں ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ امن و سکون کا گہوارہ ہوتے ہیں اور ان میں رہنے والے تمام افراد ہنسی خوشی زندگی گزارتے ہیں۔

نافرمانی اور سرکشی کی صورت میں تادیب کی اجازت ہے

اس موضوع پر گفتگو مکمل نہیں ہو سکتی جب تک یہ وضاحت نہ کر دی جائے کہ اسلام نے مذکورہ بالا تدابیر کے ساتھ ایک استثناء بھی رکھا ہے اور وہ یہ کہ نظامِ خاندان میں اگر عورت اپنے شوہر کے حکموں کی تعمیل نہ کرے اور خود سری و سرتابی کا مظاہرہ کرے تو ایسی سرکش و نافرمان عورت کی اصلاح و تادیب کے لیے شوہر کو اسے معمولی نفسیاتی یا جسمانی سزا دینے کا اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ○ (النساء: ۳۴)
>
> "اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو۔ پھر اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو۔ یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔"

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ سرکش عورتوں کی اصلاح کے لیے ان کے شوہر تین تدابیر اختیار کر سکتے ہیں: اول انھیں سمجھائیں بجھائیں۔ دوم: ان سے خواب گاہوں میں علیحدگی اختیار کر لیں۔ سوم: انھیں ماریں۔ خواب گاہوں میں رہتے ہوئے جنسی تعلق سے کنارہ کش رہنا نفسیاتی تادیب ہے اور مارنا جسمانی تادیب۔

---

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ، کویت: ۳۰/ ۳۰۵-۳۰۶

اسلام کی یہ تعلیم بعض ذہنوں میں الجھن پیدا کرتی ہے۔ اور بعض حضرات اسے اسلام پر اعتراض کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس لیے اس پر کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

'نشوز' کیا ہے؟

اس آیت میں عورتوں کی اصلاح سے متعلق جن تدابیر کا تذکرہ کیا گیا ہے انھیں اس صورت میں بروئے کار لانے کی ہدایت کی گئی ہے جب ان سے 'نشوز' کا ارتکاب ہو۔

'نشوز' کا لغوی معنی ہے بلند ہونا۔ اس معنی میں بلند زمین کو نشز اور نشاز کہتے ہیں:

> أصل النشوز الارتفاع ومنه قيل للمكان المرتفع من الأرض نشز ونشاز۔(۱)

قرآن کریم میں 'نشوز' کا استعمال شوہر اور بیوی دونوں کے تعلق سے ہوا ہے۔ شوہر کے نشوز کا مطلب ہے بیوی پر ظلم و زیادتی(۲) اور بیوی کا 'نشوز' یہ ہے کہ وہ خود کو شوہر سے بالاتر کر لے، اس کا کہنا نہ مانے، جس چیز کا شوہر حکم دے اس کے خلاف کرے اور اس سے نفرت کرے۔

راغب اصفہانیؒ (م ۵۰۲ھ) فرماتے ہیں:

> نشوز المرأة بغضها لزوجها ورفع نفسها عن طاعته۔(۳)
>
> ”عورت کے نشوز کا مطلب ہے اس کا اپنے شوہر سے نفرت کرنا اور اس کی اطاعت سے خود کو بلند سمجھنا۔“

قرطبیؒ (م ۶۷۱ھ) نے لکھا ہے:

> عصيانهن وتعاليهن عما أوجب الله عليهن من طاعة الأزواج۔(۴)

---

(۱) تفسیر طبری، ۸/ ۲۹۹، ابن منظور، لسان العرب، ۵/ ۴۱۸۔ دیگر مفسرین اور ماہرین لغت نے بھی یہی معنی بتائے ہیں۔

(۲) نشز بعلها عليها أی ضربها وجفاها۔ جوہری، تاج اللغۃ: ۱/ ۴۳۸

(۳) راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ص ۴۹۵

(۴) تفسیر قرطبی: ۵/ ۱۷۰۔۱۷۱

”یعنی وہ نافرمان ہوجائیں اور اللہ نے شوہروں کی جو اطاعت ان پر واجب کی ہے اس سے خود کو بلند سمجھنے لگیں۔“

ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں۔

النشوز هو الارتفاع فالمرأة الناشز هي المرتفعة على زوجها التاركة لأمره المعرضة عنه المبغضة له (۱)

”نشوز کے لغوی معنی بلند ہونے کے ہیں۔ نشوز کرنے والی عورت وہ ہے جو خود کو اپنے شوہر سے برتر سمجھے، اس کا کہنا نہ مانے، اس سے اعراض کرے اور اس سے نفرت کا اظہار کرے۔“

اردو مفسرین میں مولانا امین احسن اصلاحی (م ۱۹۹۷ء/ ۱۴۱۸ھ) نے لفظ 'نشوز' کی اچھی تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں:

”نشوز کے معنی سر اٹھانے کے ہیں، لیکن اس لفظ کا غالب استعمال اس سرتابی و سرکشی کے لیے ہوتا ہے جو کسی عورت کی طرف سے اس کے شوہر کے بالمقابل ظاہر ہو۔۔۔ نشوز عورت کی ہر کوتاہی، غفلت یا بے پروائی یا اپنی شخصیت اور اپنی رائے اور ذوق کے اظہار کی قدرتی خواہش کو نہیں کہتے۔ نشوز یہ ہے کہ عورت کوئی ایسا قدم اٹھاتی نظر آئے جو مرد کی قوامیت کو چیلنج کرنے والا ہو اور جس سے گھر کی مملکت میں بدامنی و اختلال پیدا ہونے کا اندیشہ ہو“ (۲)

عورت کا نشوز زبان سے بھی ہو سکتا ہے اور عمل سے بھی (۳) مفسرین اور فقہاء نے 'نشوز' کی بعض صورتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بیوی شوہر کی جنسی خواہش کی

---

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱/ ۴۹۲

(۲) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن: ۲/ ۲۹۲-۲۹۳

(۳) تفسیر کبیر: ۱۰/ ۸۲۔ بقاعی نے اس قول کو امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور: ۵/ ۲۷۱

تکمیل میں تعاون کرنے سے انکار کردے[۱]۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس میں شوہر کی ہر طرح کی نافرمانی شامل ہے۔ شیخ رشید رضا لکھتے ہیں:

> ”اکثر فقہاء نے شرعی نشوز کی چند صورتیں بیان کی ہیں: مثال کے طور پر شوہر کی جنسی خواہش پوری کرنے سے انکار کردینا، گھر سے بغیر کسی ضرورت کے نکلنا، شوہر کے کہنے کے باوجود زیب و زینت نہ اختیار کرنا، دینی فرائض سے غفلت برتنا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ نشوز کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس نافرمانی پر ہوگا جس کا سبب خود کو بڑا سمجھنا اور شوہر کے حکم سے سرتابی کرنا ہو“[۲]۔

مقصود تادیب ہے نہ کہ تشدد

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ مارنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے کہ عام حالات میں بیوی کی ضرور پٹائی کی جائے، بلکہ مخصوص صورت حال میں، جب اس کی سرکشی اور نافرمانی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہو، شوہر کو اجازت دی گئی ہے کہ اگر دیگر تدابیر سے کام نہ چلے تو ناگزیر صورت میں بیوی کو بہت معمولی اور ہلکی جسمانی سزا دے سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھنے کی تاکید کی گئی ہے کہ اس جسمانی سزا کا مقصد تادیب ہے نہ کہ بیوی پر ظلم ڈھانا اور اس پر تشدد روا رکھنا۔ اسی وجہ سے اس معاملہ میں غیر معمولی احتیاط برتنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیا تو اس میں یہ بھی فرمایا:

فاتقوا الله في النساء فإنكم أخذتموهن بأمان الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله. ولكم عليهن أن لا يوطئن فرشكم أحداً تكرهونه. فإن فعلن ذلك فاضربوهن ضرباً غير

---

(۱) وقیل منعها نفسها من الاستمتاع بها إذا طلبها لذلك. ابوحیان، البحر المحیط: ۳/ ۲۴۰

(۲) تفسیر المنار: ۵/ ۷۶

مُبرّح ولھن علیکم رزقھن و کسوتھن بالمعروف۔(۱)

”عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تم نے انھیں اللہ کی امان میں لیا ہے اور ان کی شرم گاہیں تمھارے لیے اللہ کے کلمہ کے ذریعے حلال ہوئی ہیں۔ تمھارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمھارے بستروں پر ایسے کسی شخص کو نہ آنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو انھیں ایسی مار مارو کہ اس کا جسم پر کوئی نشان ظاہر نہ ہو اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ انھیں دستور کے مطابق کھانا کپڑا دو۔“

امام ترمذی نے حضرت عمرو بن الاحوصؓ کے واسطے سے یہ خطبۂ حجۃ الوداع نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ کچھ مختلف ہیں۔ اس میں ہے:

... الا ان یاتین بفاحشة مبینة، فان فعلن فاھجروھن فی المضاجع واضربوھن ضرباً غیر مبرح(۲)

”... مگر یہ کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو انھیں بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور انھیں مارو، ایسی مار جس کا جسم پر کوئی نشان ظاہر نہ ہو۔“

'ضرب مبرح' اس مار کو کہتے ہیں جس میں سخت چوٹ لگے۔ حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔(۳)

حضرت ابن عباسؓ سے ان کے شاگرد عطاؒ نے دریافت کیا 'ضرب غیر مبرح' سے مراد کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: مسواک جیسی چیز سے مارنا۔(۴)

مارنے کا مقصد عورت کو ذلیل و رسوا کرنا، یا اسے جسمانی اذیت پہنچانا نہیں، بلکہ اس کی اصلاح و تادیب ہے، اس لیے علماء نے صراحت کی ہے کہ شوہر مارنے میں حتی الامکان احتیاط

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی، ۱۲۱۸

(۲) جامع ترمذی، ابواب الرضاع، باب ما جاء فی حق المرأۃ علی زوجہا، ۱۱۶۳، ابواب تفسیر القرآن، سورۃ توبہ، ۳۰۸۷، حسنہ الالبانی

(۳) ابن الاثیر الجزری، النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر: ۱/۷۰

(۴) تفسیر طبری: ۸/۳۱۳

ملحوظ رکھے۔ مثلاً چہرے پر نہ مارے، ایک ہی جگہ نہ مارے، لاٹھی ڈنڈے سے نہ مارے، بلکہ ہاتھ سے، رومال سے یا کسی اور ہلکی چیز سے مارے، جس سے جسم پر کوئی نشان نہ پڑے۔ امام رازیؒ نے مارنے میں مختلف احتیاطی تدابیر بتانے کے بعد لکھا ہے:

وبالجملة فالتخفيف مراعى في هذا الباب على أبلغ الوجوه(١)

”حاصل یہ کہ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ تخفیف ملحوظ رکھنی چاہیے۔“

اصلاحی تدابیر اختیار کرنے میں تدریج

ایک بات یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ قرآن کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ اصلاحی تدابیر میں تدریج ملحوظ رکھی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ عورت کی جانب سے سرکشی کا اظہار ہوتے ہی بہ یک وقت تینوں تدابیر پر عمل کر لیا جائے، یا شوہر جب جس چیز کو چاہے بروئے کار لے آئے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

”آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سمجھانے کا حکم دیا ہے، پھر اس سے آگے بڑھ کر بستروں میں تنہا چھوڑنے کو کہا ہے، پھر اس سے آگے بڑھ کر مارنے کا حکم دیا ہے۔ یہ اس کی تنبیہ ہے جس سے تقریباً صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہلکے طریقے سے مقصد حاصل ہو وہاں تک اس پر اکتفا کرنا ضروری ہے۔ اسے چھوڑ کر سخت طریقے کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔“(٢)

علامہ ابن الجوزیؒ (٥٩٧ھ) نے بعض اصحاب علم کا یہ قول نقل کیا ہے:

الآية على الترتيب فالوعظ عند خوف النشوز، والهجر عند ظهور النشوز والضرب عند تكرره واللجاج فيه، ولا يجوز الضرب عند ابتداء النشوز(٣)

---

(١) تفسیر کبیر: ١٠/ ٨٣

(٢) حوالہ سابق

(٣) ابن الجوزی: زاد المسیر فی علم التفسیر: ٢/ ٧٩

> ”آیت میں ترتیب ہے۔ سمجھایا اس وقت جائے گا جب سرکشی کا اندیشہ ہو۔ تنہا اس وقت چھوڑا جائے گا جب سرکشی کا اظہار ہو اور مارا اس وقت جائے گا جب سرکشی کا بار بار اعادہ ہو اور عورت مستقل اس کا ارتکاب کرنے لگے۔ سرکشی کی ابتدا ہی میں مارنا جائز نہیں۔“

قاضی ابن العربی المالکی (م ۵۴۳ھ) نے اس قول کو سعید بن جبیرؒ کی جانب منسوب کرتے ہوئے اسے آیت مذکورہ کی سب سے اچھی تفسیر قرار دیا ہے۔(۱)

مارنے کا حکم موجب قدح نہیں

اسلام پر اعتراضات کرنے والوں نے قرآن کے اس حکم کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے نزدیک یہ عورت کی انسانیت کی توہین و تذلیل ہے کہ کوئی شخص، خواہ وہ شوہر ہی کیوں نہ ہو، اسے مارے پیٹے۔ قابل غور یہ ہے کہ قرآن نے یہ حکم اس صورت میں، جب دیگر تدابیر ناکام ہو جائیں، ناگزیر علاجی تدبیر کے طور پر دیا ہے۔ اس کا یہ حکم عام حالات میں اور عام عورتوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس مخصوص صورت حال کے لیے ہے جب عورت خود سر ہو جائے، مرد سے نفرت کرنے لگے، اس کا کہنا نہ مانے اور اسے اپنے سے کم تر سمجھنے لگے۔ جن لوگوں کو قرآن کا یہ حکم عورت کی توہین و تذلیل معلوم ہوتا ہے انھیں عورت کے باغیانہ تیور اور خودسری پر مبنی رویے میں مرد کی تحقیر و تذلیل کا پہلو نظر نہیں آتا۔

علامہ رشید رضاؒ نے لکھا ہے:

> ”ہمارے یہاں سرکش عورت کو مارنے کی مشروعیت پر مغربی تہذیب و معاشرت کی نقالی کرنے والے بعض حضرات ناک بھوں چڑھاتے اور ناگواری کا اظہار کرتے ہیں۔ انھیں اس پر کوئی ناگواری نہیں ہوتی کہ عورت مرد کی سرتابی کرے، اس پر اپنی بڑائی جتائے اور گھر کے سربراہ کو اپنا ماتحت، بلکہ حقیر سمجھے، اپنی سرکشی پر مصر رہے، یہاں تک کہ نہ اس کے وعظ و نصیحت پر نرم پڑے، نہ اس کی بے رخی اور ترک تعلق کی

---

(۱) ابن العربی المالکی، احکام القرآن: ۱/ ۱۷۵۔ آیت میں ترتیب مقصود ہونے کی بات دیگر مفسرین نے بھی کی ہے۔

کوئی پروا کرے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ لوگ ایسی سرکش عورتوں کا کیوں کر علاج کرتے ہیں اور ان کے شوہروں کو ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ شاید ان کے تصور میں ایک ایسی عورت ہوتی ہے جو نحیف و نزار، تہذیب یافتہ اور اعلیٰ اخلاق کی حامل ہے، جس پر ایک تند خو اور سنگ دل مرد ظلم ڈھاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے تر و تازہ گوشت سے اپنے کوڑے کا پیٹ بھرتا اور اس کے تازہ خون سے اسے سیراب کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس قسم کی مار مارنے کی اجازت دے رکھی ہے اور وہ اسے خواہ کتنی ہی تکلیف پہنچائے اور کیسی ہی سزا دے اس پر کوئی گناہ نہیں، جیسا کہ بہت سے سنگ دل اور درشت خو مرد کرتے ہیں۔ حاشا للہ۔ اللہ تعالیٰ اس ظلم کی اجازت دیتا ہے نہ اسے پسند کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے مرد تند خو اور سنگ دل ہوتے ہیں، جو عورت پر خواہ مخواہ ظلم و زیادتی کرتے ہیں۔ ایسے مردوں کی تنبیہ کے لیے بہت سی احادیث آئی ہیں اور ان کے معاملے میں قرآن کریم میں 'تحکیم' کا اصول بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ بہت سی عورتیں زبان دراز، سرکش اور بہانے باز ہوتی ہیں۔ وہ اپنے شوہروں سے نفرت کرتی ہیں، ان کے احسانات کی ناشکری کرتی ہیں، محض بغض و عناد میں ان کے حکموں کی سرتابی کرتی ہیں، انھیں ایسے کاموں پر مجبور کرتی ہیں جو ان کے بس میں نہیں ہوتے۔ روئے زمین میں کیا فساد واقع ہو جائے گا اگر کسی متقی و پرہیزگار مرد کو اجازت دے دی جائے کہ وہ کسی ایسی عورت کے ہاتھ پر ایک مسواک مار کر یا اس کی گردن پر ایک چپت رسید کر کے اس کے بغض میں کچھ کمی کر دے یا اس کی سرکشی و غرور کا پارہ کچھ اتار دے؟! اگر اس چیز کا جواز ان کے مزاجوں پر گراں گزرتا ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے مزاجوں میں فساد آ گیا ہے اور انھیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ان کے بہت سے انگریز دانش ور پڑھی لکھی، تہذیب یافتہ، لباس پہننے کے باوجود عریاں نظر آنے والی، دوسروں کی طرف مائل ہونے والی اور دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی عورتوں کو مارتے رہے ہیں۔ ایسا ان کے دانش وروں نے بھی کیا ہے اور [illegible]

> لوگوں نے بھی، ان کے حکم رانوں نے بھی کیا ہے اور ان کے سربرآوردہ طبقہ کے لوگوں نے بھی۔ یہ ایک ضرورت ہے جس سے ان تعلیم یافتہ عورتوں کی عزت افزائی میں غلو کرنے والے بے نیاز نہیں ہیں تو ایک ایسے مذہب میں اس کی ضرورت اور اس کے مباح ہونے پر ناگواری کا کیوں کر اظہار کیا جاسکتا ہے جو بدوی اور متمدن، انسانوں کے تمام طبقات کے لیے عام ہے۔"(۱)

خلاصہ یہ کہ اسلام کی ان تعلیمات میں غیر معمولی اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ اس نے عورت پر بے ظلم ڈھانے اور تشدد کرنے کی اجازت دی ہے نہ اسے کھلی چھوٹ دے دی ہے کہ وہ شوہر کی جتنی چاہے نافرمانی کرے مگر شوہر اس سے کچھ نہ کہے۔ اس نے ایک طرف شوہر کو حکم دیا کہ بیوی کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آئے اور اچھا سلوک کرے، دوسری طرف اس کو اس بات کی بھی اجازت دی کہ اگر بیوی کی طرف سے سرکشی کا مظاہرہ دیکھے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرے اور ضرورت پڑنے پر اس کی تادیب اور سرزنش کرے۔

☆☆☆

---

(۱) تفسیر المنار: ۵/ ۷۴-۷۵

بوڑھوں کے عافیت کدے

سماجی میدان میں جن چیزوں کا شمار موجودہ دور کی اہم کارگزاریوں میں ہوتا ہے ان میں سے ایک عمر رسیدہ شہریوں (SENIOR CITIZENS) کے لیے رفاہی اور ثقافتی اداروں کا قیام ہے۔ ان اداروں کو DAY CARE CENTRES, OLD AGE HOMES, RETIREMENT NURSING HOMES, اور PAID HOME CARE جیسے خوب صورت نام دیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان اداروں نے سماج کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ ان میں معمر، معذور اور بے سہارا افراد کی، جن سے ان کے اپنے بھی منہ پھیر لیتے ہیں، مناسب دیکھ بھال کی جاتی ہے، انھیں سکون، اطمینان اور آزادی کا ماحول فراہم کیا جاتا ہے اور وہاں اپنے ہم عمروں کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری ایام بڑی خوشی و مسرت کے ساتھ کٹ جاتے ہیں۔ بہ ظاہر یہ ایک اہم انسانی خدمت اور موجودہ دور کی ایک بڑی یافت (ACHEIVMENT) معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے پیچھے کرب والم کا جو اتھاہ سمندر موج زن ہوتا ہے وہ عموماً لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے۔

آئندہ سطور میں پہلے اس معاملہ میں موجودہ دور کی کوششوں، اس کے محرکات اور نتائج کا بہت ہی اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے گا، پھر اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی جائے گی۔

نوعیتِ مسئلہ

بڑھاپا انسانی زندگی کا ایک فطری مرحلہ ہے۔ ہر شخص، جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ اپنی عمر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بڑھاپے کو پہنچتا ہے۔ اس مرحلے میں اس کے

جسمانی قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور اس کی دماغی اور فکری صلاحیتیں بھی کمزور پڑ جاتی ہیں۔ وہ حصول معاش کے لیے تگ و دو کے قابل نہیں رہ جاتا۔ یہاں تک کہ جب اس کی جسمانی کمزوری میں مزید اضافہ ہوتا ہے تو وہ اپنے روز مرہ کے کاموں کی انجام دہی کے لیے بھی دوسروں کے سہارے کا محتاج ہو جاتا ہے۔ لیکن موجودہ دور کی نئی نسل اپنی زندگی کو بہتر اور خوش گوار بنانے میں اس قدر مصروف ہے کہ اسے اپنے بزرگوں کو سہارا دینے کی فرصت نہیں۔ اس کے پاس موقع نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارے، ان سے بات چیت کر سکے، ان کے دکھ درد کو سن سکے اور ان کی ضروریات پوری کر سکے۔ اس صورت حال میں یہ بزرگ بھرے خاندان میں ہونے کے باوجود تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ افراد خاندان کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے کے باوجود ان کی جانب سے ہم دردی، غم گساری اور اپنائیت سے محرومی کا احساس انھیں کاٹے کھاتا ہے۔ وہ رنج و الم کی مجسم تصویر بن جاتے ہیں اور گھٹ گھٹ کر اپنی زندگی کے آخری دن کاٹنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اس سماجی المیہ نے ضرورت پیدا کی کہ ان عمر رسیدہ افراد کی دیکھ ریکھ کا انتظام کیا جائے اور ان کی پسند کا ماحول فراہم کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں بوڑھوں کے عافیت کدے (OLD AGE HOMES) قائم کیے گئے۔

'اولڈ ایج ہومس' کی تاریخ اور موجودہ صورت حال

اولڈ ایج ہومس اصلاً بیسویں صدی عیسوی کی پیداوار ہیں۔ انیسویں صدی سے قبل ان کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بعد میں ایسے اداروں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ تاریخی طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۸۲۳ء میں فلاڈلفیا (امریکہ) میں INDIGENT WIDOWS AND SINGLE WOMEN'S SOCIETY کے نام سے اور ۱۸۵۰ء میں بوسٹن (امریکہ) میں HOME FOR AGED WOMEN کے نام سے بے سہارا خواتین کے لیے رفاہی ادارے قائم ہوئے۔ پھر بیسویں صدی میں ایسے اداروں کا قیام کثرت سے ہونے لگا اور خاص طور پر اس صدی کے نصف آخر میں اس معاملے میں تیزی آئی اور بڑے پیمانے پر عمر رسیدہ افراد کی رہائش

کے لیے مراکز قائم ہوئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۵ء میں امریکا میں بوڑھوں کے لیے قائم نرسنگ ہومس کی تعداد گیارہ ہزار تھی۔ اس کے بعد کے پانچ سال میں مزید ایک ہزار کا اضافہ ہوا، جس سے ۲۰۱۰ء میں ان کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔ متعدد یورپی ممالک کا بھی یہی حال ہے۔ اسپین میں تقریباً پانچ ہزار نرسنگ ہومس قائم ہیں۔ ان میں سے بیش تر پرائیوٹ ہیں، صرف چند ہی سرکاری سرپرستی میں چل رہے ہیں۔ ان نرسنگ ہومس میں سے زیادہ تر گزشتہ ایک دہائی میں قائم ہوئے ہیں۔ ۲۰۰۶ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ناروے، نیدرلینڈ اور ڈنمارک میں عمر رسیدہ افراد میں سے صرف چار فی صدی ایسے خوش قسمت ہیں، جنھیں اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھروں میں زندگی گزارنا نصیب ہوتا ہے، بقیہ اولڈ ایج ہومس میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اب مغربی ممالک میں بڑے بڑے Retirement Resorts قائم ہونے لگے ہیں، جن کے تمام مکین عمر رسیدہ افراد ہوتے ہیں، ان کے لیے ہر طرح کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں، حتی کہ ان کی خدمت گزاری کے لیے خودکار مشینوں (ROBOT NURSES) کا سہارا لیا جانے لگا ہے۔

ہندوستان کی صورت حال بھی دیگر ملکوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یوں تو یہاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر (۱۷۸۲ء) میں سب سے پہلے اولڈ ایج ہوم کے قیام کا سراغ ملتا ہے، مگر ابتدا میں اس کام کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان اداروں میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں بہت تیزی سے اس طرح کے ادارے قائم ہونے لگے۔ MADRAS INSTITUTE OF AGING کے ایک سروے کے مطابق ہندوستان میں ۱۹۵۰ء سے قبل صرف ۹۶؍ اولڈ ایج ہومس تھے۔ بعد کی دو دہائیوں میں مزید ۹۳ ہومس کا اضافہ ہوا۔ پھر ہر دہائی میں سو سے زائد اولڈ ایج ہومس قائم ہوتے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۹۵ء میں ان کی تعداد ۵۲۹ تک پہنچ گئی۔ ان میں سے ۲۰ فی صد ہومس صرف کیرلا میں تھے۔ کیرلا کے ساتھ تامل ناڈو، کرناٹک اور آندھرا پردیش کی ریاستوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو جنوبی ہند میں اولڈ ایج ہومس کی تعداد پورے ملک کی مجموعی تعداد کا نصف تھی۔(1)

---

(1) How away from home: A survey of old age homes and inmates in Kerala, S. Irudaya Rajan, Centre for development studies, Thiruvananthapuram, Aug 2000 یہ سروے رپورٹ انٹرنیٹ پر موجود ہے۔

عمر رسیدہ افراد کی فلاح و بہبود کے لیے ایک سماجی تنظیم HELP AGE INDIA کے نام سے کام کرتی ہے۔ اس نے ۲۰۰۹ء میں ملک میں قائم اولڈ ایج ہومس کی ڈائرکٹری شائع کی ہے۔ اس کے مطابق ان کی تعداد ۱۲۷۴ ہے۔ جن ریاستوں میں ایسے ہومس کی تعداد سو سے زائد ہے وہ ہیں تامل ناڈو (۲۵۱) کیرلا (۱۸۲) مغربی بنگال (۱۶۴) مہاراشٹرا (۱۳۳) اور آندھرا پردیش (۱۱۴)، جب کہ اسی تنظیم کے سروے کے مطابق ۱۹۹۸ء میں پورے ملک میں ان ہومس کی مجموعی تعداد سات سو تھی۔

Help Age India نے دہلی و اطراف کے اولڈ ایج ہومس کا بھی سروے کرایا ہے۔ اس کی رپورٹ نومبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی تھی اور انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے۔ سروے میں ۳۰ ہومس کا احاطہ کیا گیا۔ ان میں سے ۴ سرکاری انتظام کے تحت ہیں، بقیہ کو غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) چلاتی ہیں۔ ان میں سے صرف ۱۵ فی صد پچاس سال پرانے ہیں، ۱۵ فی صد کا زمانہ قیام بیس سال کے اندر ہے اور ۷۰ فی صد گزشتہ ۱۰ سال کے اندر قائم ہوئے ہیں۔

اس تفصیل سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اولڈ ایج ہومس کے تصور کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کتنی تیزی سے فروغ ملا ہے۔

فراہم کی جانے والی سہولیات

ان ہومس کا ایک اور پہلو سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ان میں عمر رسیدہ افراد کی ضرورت کی ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کھانے پینے کا معقول انتظام ہوتا ہے۔ حفظان صحت کے وسائل فراہم کیے جاتے ہیں، مثلاً گارڈن، جوگنگ ٹریک (Jogging Track) یوگا وغیرہ۔ علاج معالجہ کا بہتر نظم کیا جاتا ہے۔ ذہنی سکون اور تفریح کے لیے کامن روم اور ٹیلی ویژن، علمی ذوق کی آبیاری کے لیے لائبریری، ریڈنگ روم، کمپیوٹر روم اور عبادت کے لیے جگہ (Prayer Room) باہری دنیا سے رابطہ کے لیے ٹیلی فون اور انٹرنیٹ وغیرہ کی سہولیات دی جاتی ہیں۔ کچھ ہومس یہ خدمات مفت فراہم کرتے ہیں تو کچھ ان کے لیے فیس وصول کرتے ہیں۔ Help Age India کے مذکورہ بالا سروے کے مطابق دہلی کے ۳۰

ہومس میں سے ۱۴ ادارے اپنی خدمات مفت فراہم کرتے ہیں، ۶۰ فیس وصول کرتے ہیں اور ۲۶ ادارے ایسے ہیں جو عام طور سے تو فیس لیتے ہیں، لیکن کچھ افراد کو بلا معاوضہ اپنے یہاں داخلہ دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان ہومس میں عمر رسیدہ افراد کو ضرورت کی ہر چیز حاصل رہتی ہے۔ اگر محروم رہتے ہیں تو اپنوں کے قرب، نگہداشت اور محبت سے۔ چنانچہ ان ہومس میں اس کا بھی نظم ہوتا ہے کہ ان میں رہنے والے کسی فرد کا انتقال ہو جائے تو پہلے اس کے بیٹے، بیٹی یا متعلقہ عزیز کو مطلع کیا جاتا ہے۔ اگر وہ خود اس کی آخری رسوم ادا کرنے میں دل چسپی لے تو اس کی نعش کو اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے، ورنہ ان ہومس کے مصارف پر ہی اس کی آخری رسوم ادا کر دی جاتی ہیں۔

بوڑھوں کی اپنے گھروں سے بیزاری کے اسباب

ہر شخص کو فطری طور پر اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے۔ وہاں وہ اپنی زندگی کے قیمتی ایام گزارتا ہے، اس لیے اس کے در و دیوار سے اسے انس ہوتا ہے اور افراد خانہ سے تعلق خاطر تو فطری ہے۔ اس کے باوجود وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر عمر رسیدہ افراد اپنے گھروں سے بے زار ہو جاتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اولڈ ایج ہومس کو ترجیح دیتے ہیں؟ غور کرنے سے اس کے چند اسباب معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ عمر رسیدہ افراد کو اپنے بڑھاپے میں جتنی خبر گیری، نگہداشت اور دیکھ بھال کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ انھیں گھر میں نہیں مل پاتی۔ ان کے بیٹے ملازمت اور روزگار کے مسائل میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کی طرف پوری توجہ نہیں دے پاتے۔ وہ زیادہ تر اوقات گھر سے باہر رہتے ہیں اور جب گھر آتے ہیں تو ان کی عافیت پسندی انھیں اپنے خول میں بند رکھتی ہے اور وہ اپنے آرام کو تج کر والدین کی خدمت پر آمادہ نہیں ہوتے۔

۲۔ گھر کا سربراہ باپ ہوتا ہے۔ وہ اس کا نظم و نسق چلاتا ہے۔ اس کے چھوٹے بڑے معاملات میں اس کی بات فیصلہ کن ہوتی ہے۔ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد بھی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ تمام افراد خانہ اس کی بات مانیں اور اس کی پسند و ناپسند کو اپنی پسند و ناپسند سمجھیں۔ دوسری طرف بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی مرضی چلانا چاہتے ہیں۔ مزاجوں کا

اختلاف بسا اوقات ٹکراؤ کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ اس حال میں اگر بچے باپ کی کوئی بات نہ مانیں تو اسے اپنی سبکی محسوس ہوتی ہے اور گھر سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔

۳۔ رشتوں کی اہمیت کا احساس کم ہو گیا ہے۔ بہو اپنے خسر کی اس طرح دیکھ بھال نہیں کر پاتی جس طرح شادی سے قبل اپنے باپ کی کرتی تھی، دوسری طرف خسر اپنی بہو سے ویسی خدمت کی امید رکھتا ہے جیسی اس کی اپنی بیٹی کرتی تھی۔ اگر بہو کسی اجنبی خاندان سے آئی ہے تو بسا اوقات اسے خسر سے کوئی اپنائیت اور اُنس نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف یہ کہ خود اپنے خسر کی دیکھ بھال نہیں کرتی، بلکہ اپنے شوہر کو بھی صراحتاً یا اشارۃً اس سے روکتی ہے۔

۴۔ والدین اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں، ان پر اپنی گاڑھی کمائی خرچ کرتے ہیں، خود تکلیفیں اٹھا کر انھیں آرام پہنچاتے ہیں، لیکن جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور ان کے والدین بوڑھے اور سہارے کے محتاج ہوتے ہیں تو بچوں میں شکر گزاری کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ خود غرضی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے والدین کو ان کے ان احسانات کا بدلہ نہیں دے پاتے جو انھوں نے ان کے ساتھ ان کے بچپن میں کیے تھے۔

۵۔ بسا اوقات مالی پریشانیاں بھی والدین کی خدمت اور دیکھ بھال میں حارج ہوتی ہیں۔ بیٹے کی آمدنی کم ہوتی ہے۔ اس سے وہ اپنے بیوی بچوں کی کفالت ہی مشکل سے کر پاتا ہے، اس بنا پر والدین کی کما حقہ خدمت نہیں کر پاتا۔

کیرلا کے مذکورہ بالا سروے میں ایک سوال یہ بھی شامل کیا گیا تھا کہ آپ اپنا گھر ہوتے ہوئے اولڈ ایج ہوم میں کیوں آئے؟ ۷۲ فی صد افراد نے اس سوال کا یہ جواب دیا کہ گھر میں خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

کوئی ادارہ خاندان کا متبادل نہیں

عمر رسیدہ افراد کو اپنے گھروں میں اور اپنے عزیزوں کے درمیان چین و سکون نہ ملا تو ان کے لیے اولڈ ایج ہومس قائم کیے گئے۔ لیکن یہ مسئلے کا حقیقی اور پائیدار حل نہیں ہے۔ کہنے کو تو ان ہومس میں بوڑھوں کو ضرورت کی ہر چیز دستیاب رہتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے

عزیزوں کی محبت کے لیے ہر آن ترستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ فطری خواہش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب وہ خود کو اپنے خاندان کے درمیان پائیں اور اپنے عزیزوں کے ذریعے ان کی خبر گیری ہو۔ اسی وجہ سے سماجی ماہرین نے اولڈ ایج ہوم کے تصور کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اس کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں امریکہ کے ایک سوشل تجزیہ کار Abraham Epstein نے اولڈ ایج ہومس کے بارے میں لکھا تھا:

> ”یہ ادارے صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ عمر رسیدہ افراد اب اس صنعتی دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہے۔ یہ رفاہی ادارے سرگرم زندگی گزارنے کے بعد روزینہ پانے والے افراد کی انتہائی اہانت اور تذلیل کی خوف ناک علامت ہیں۔“(۱)

بوڑھوں کے لیے قائم ہونے والے یہ ادارے بہ ظاہر بڑے خوش نما معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے ان کے بارے میں کتنا حقارت آمیز تصور کارفرما ہے اس کا اظہار جناب پی۔ کے۔ مشرا (P.K. Misra) نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”مغرب میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اولڈ ایج ہومس، پنشن، سوشل سیکیوریٹی اور ہیلتھ کیئر کی سہولیات فراہم کی گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اہم اقدامات ہیں، لیکن یہ تمام پروگرام اس تصور کے ساتھ چلائے گئے کہ بوڑھے اپنی زندگی جی چکے، اب بس انھیں کچھ مادی سہولت اور جسمانی آرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھیں حاشیہ پر ڈال دیا گیا، سرگرم زندگی سے انھیں الگ تھلگ کر دیا گیا اور انھیں 'بے کار چیز' (Waste) کی کیٹیگری میں جگہ دے دی گئی۔“

اس کے مقابلے میں خاندان کے ادارہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”بوڑھوں کی خبر گیری کا مطلب ہے قدامت پسندی اور انسانیت نوازی کی اہمیت کو

---

(1) Abraham Epstein, The Challenge of the aged, Alfred A. Knupf, New York, 1929, p.128

اجاگر کرنا۔ اس سے یقیناً قوم کو طاقت حاصل ہوگی۔ بوڑھوں کی خبر گیری بہتر انداز سے خاندان کے دائرہ ہی میں ہو سکتی ہے، جب ان کے بیٹے بیٹیاں اس کو اپنی ذمے داری اور فرض سمجھیں۔ کوئی ادارہ خاندان کا بدل نہیں بن سکتا"۔(1)

اسلام کا نقطۂ نظر

اسلام نے اس مسئلے کو بہت خوب صورتی سے حل کیا ہے۔ اس نے سماج میں عمر رسیدہ افراد کو عزت و احترام کا مقام دیا ہے، ان کے حقوق بیان کیے ہیں اور ان کے متعلقین کو ان کی ادائی کا پابند کیا ہے۔ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں مسلم تاریخ کے کسی عہد میں 'اولڈ ایج ہومس' قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ذیل میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلام کے ان اقدامات اور تعلیمات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

بڑھاپا انسانی زندگی کا ایک فطری مرحلہ ہے

قرآن کریم میں تخلیق انسانی کے مراحل مختلف مقامات پر بیان کیے گئے ہیں اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی خلاقی، علم اور قدرت پر استدلال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّشَيْبَةً ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ○ (الروم: ۵۴)

"اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمھاری پیدائش کی ابتدا کی، پھر اس ضعف کے بعد تمھیں قوت بخشی، پھر اس قوت کے بعد تمھیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

سورۂ مومن میں یہی مضمون کسی قدر تفصیل سے وارد ہوا ہے:

---

(1) Development Problems and Traditional Cultures: Reflections on the Management of the aged in India, P.K. Misra

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا ۚ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ مِن قَبْلُ ۖ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○ (المومن:٦٧)

"وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقرر وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔"

اس آیت میں پیدائش سے قبل اور پیدائش کے بعد دونوں کے مراحل کا بیان ہے۔ پیدائش سے قبل کے تین مرحلے مذکور ہیں: تراب (مٹی) نطفہ اور علقہ۔ تراب سے، سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کی طرف اشارہ ہے۔ موخر الذکر دو مرحلوں کے علاوہ ایک تیسرے مرحلے (مضغہ) کا بیان سورہ الحج: ۵ اور سورہ المومنون: ۱۴ میں ہوا ہے۔ اوپر درج دونوں آیتوں میں پیدائش کے بعد کے تین مراحل کا تذکرہ ہے: بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ ان میں یہ بھی صراحت ہے کہ بچپن میں انسان کم زور و ناتواں رہتا ہے، جوانی میں طاقت ور اور توانا ہو جاتا ہے، بڑھاپے میں پھر اس کے اعضائے بدن میں کم زوری و ناتوانی لوٹ آتی ہے اور وہ اسی طرح دوسروں کے سہارے کا محتاج ہو جاتا ہے جس طرح بچپن میں تھا۔ جب بڑھاپے میں مزید اضافہ ہوتا ہے تو انسان کی عقل بھی ماؤف ہو جاتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے میں وہ مزید ہم دردی اور توجہ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسے 'ارذل العمر' (بدترین عمر) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ ۚ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ○

(النحل: ٧٠) (١)

---

(١) یہی مضمون کسی قدر تفصیل کے ساتھ سورۂ حج کی آیت ۵ میں بھی مذکور ہے۔

> ”اور دیکھو اللہ نے تم کو پیدا کیا، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، اور تم میں سے کوئی بدترین عمر کو پہنچا دیا جاتا ہے، تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی کامل ہے اور قدرت میں بھی۔“

انسانی زندگی کے مختلف مراحل کی یہ تفصیل بتا کر قرآن انسانوں میں یہ احساس بیدار رنا چاہتا ہے کہ وہ عمر رسیدہ افراد کے ساتھ بہتر سلوک کریں، ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں، ن کے کام آئیں اور ان کی ضرورتیں پوری کریں، اس لیے کہ عین ممکن ہے کہ وہ خود بھی بڑھاپے ی عمر کو پہنچیں تو دوسروں سے اسی برتاؤ کے مستحق ہوں۔

افرادِ خاندان کے درمیان قریبی اور گہرا تعلق

انسان جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچتا ہے تو خود کو ایک بھرے خاندان میں پاتا ہے۔ اس کے بیٹے بیٹیاں جوان ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان کی شادی کے نتیجے میں بیٹیاں دوسرے خاندان ں پہنچ جاتی ہیں اور دوسرے خاندانوں کی لڑکیاں اس کے گھر بہو بن کر آجاتی ہیں۔ پھر ان کی ولادیں ہوتی ہیں تو پوتوں، پوتیوں، نواسوں، نواسیوں کی شکل میں اس کے آنگن میں بچوں کا شور وغل اور ہنگامے سنائی دیتے ہیں۔ اس چیز کو قرآن انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل شدہ یک نعمت قرار دیتا ہے:

> وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (النحل: ۷۲)
>
> ”اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے تمھاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمھیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمھیں کھانے کو دیں۔“
>
> وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ○ (الفرقان: ۵۴)
>
> ”اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔“

افرادِ خاندان کے درمیان گہرا اور قریبی تعلق ہو تو انسان کو بڑی خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ شاداں و فرحاں رہتا اور زمانے کے مصائب و آفات کو بھول جاتا ہے۔ ان کا وجود اس کے دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے اہلِ ایمان اس کے متمنی اور سراپا دعا رہتے ہیں:

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ

(الفرقان: ۷۴)

"جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے۔"

رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم

نسب اور سسرالی تعلق کے نتیجے میں جو رشتے وجود میں آتے ہیں، اسلام انھیں خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ یوں تو اس کی نظر میں تمام انسان بھائی بھائی ہیں، ایمان کا رشتہ مزید قربت و تعلق پیدا کر دیتا ہے، چنانچہ اگر کبھی انھیں کوئی ضرورت درپیش ہو تو ان کی مدد میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، لیکن خونی رشتہ داروں کا حق ان سے بڑھ کر ہے۔ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، ان کے دکھ درد میں کام آنا اور ان کی ضرورتیں پوری کرنا صرف اخلاقی تقاضا نہیں، بلکہ ایک ذمے داری ہے، جسے لازماً ادا کرنا چاہیے:

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَن تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُم مَّعْرُوفًا

(الاحزاب: ۶) (۱)

"کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو۔"

رشتہ داروں کا حق ادا کرنے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے:

---

(۱) یہی مضمون سورہ الانفال کی آیت ۷۵ میں بھی وارد ہوا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ (النحل: ۹۰)

"اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔"

دوسری طرف اہل قرابت سے تعلقات بگاڑنے کی ممانعت آئی ہے اور ان کے حقوق کی پامالی پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ○ (النساء: ۱)

"اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ما من ذنب أجدر ان يعجل الله تعالى لصاحبه العقوبة في الدنيا مع ما يدخر له في الآخرة من البغي وقطيعة الرحم (۱)

"ظلم اور رشتہ کی پامالی سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں، جس پر اللہ تعالیٰ نے آخرت میں طے شدہ سزا کے ساتھ، اس کا ارتکاب کرنے والے کے لیے اس دنیا ہی میں سزا مقدر نہ کر دی ہو۔"

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید

انسان کا اپنے رشتہ داروں میں سب سے قریبی تعلق والدین سے ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اس دنیا میں اس کے وجود کا ذریعہ بنتے ہیں، بلکہ پیدائش کے بعد اسے پال پوس کر بڑا کرتے اور مکروہات زمانہ سے بچاتے ہوئے زندگی کی دوڑ دھوپ میں شامل ہونے کے قابل بناتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم میں والدین کا تذکرہ رشتہ داروں سے قبل کیا گیا ہے اور ان کی خصوصی اہمیت کی وجہ سے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم علیحدہ سے دیا گیا ہے:

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی النہی عن البغی: ۴۹۰۲، مسند احمد: ۵/ ۳۶، ۳۸

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى.... (النساء:٣٦)

"اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ......"

قرآن کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل سے جب مکمل اطاعت کا عہد لیا گیا تھا تو انھیں بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی تھی:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ. (البقرۃ:٨٣)

"یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا ......"

درج بالا دونوں آیتوں میں سب سے پہلے اللہ واحد کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے بعد دوسرے رشتہ داروں اور سماج کے دیگر افراد کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو کہا گیا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں یہی بات زیادہ زوردار انداز میں کہی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (بنی اسرائیل:٢٣)

"تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔"

اس آیت میں بلاغت کے متعدد پہلو پوشیدہ ہیں:

آیت کا آغاز لفظ 'قضی' سے کیا گیا ہے۔ اس میں کسی چیز کے بہت تاکید کے ساتھ حکم دینے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ علامہ زمخشری نے لکھا ہے:

(وَقَضَى رَبُّكَ) وأمر أمرًا مقطوعًا به(۱)

”وَقَضَى رَبُّكَ کا مطلب یہ ہے کہ تیرے رب نے قطعی طور سے اس چیز کا حکم دیا ہے۔“

قرطبیؒ فرماتے ہیں:

قَضَى أي أمر وألزم وأوجب(۲)

”قضیٰ کا مطلب ہے کہ اس کا حکم دیا، اس کو لازم کیا اور اس کو واجب قرار دیا۔“

اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، پھر والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ ان دونوں حکموں کے درمیان متعدد مناسبتیں پائی جاتی ہیں۔ پہلی مناسبت یہ ہے کہ انسان کے وجود کا سبب حقیقی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کی ہے اور سبب ظاہری یہ ہے کہ والدین اس کا ذریعہ بنے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے سبب حقیقی کی تعظیم کا، پھر سبب ظاہری کی تعظیم کا حکم دیا ہے۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ محسن و منعم کی شکر گزاری واجب ہوتی ہے اور منعم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، جو خالق ہے اور مخلوق میں سے سب سے بڑا احسان انسان پر اس کے والدین کا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے خالق کے احسان پر شکر بجالانے کا حکم دیا، پھر والدین کے احسان پر ان کی شکر گزاری کی تلقین کی(۳)

اس آیت میں اور خاص طور پر اس کے الفاظ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا میں متعدد پہلوؤں سے بڑی بلاغت اور زورِ بیان پایا جاتا ہے:

۱۔ اس سے پہلے کی آیت میں اخروی سعادت کا تذکرہ ہے اور اس آیت میں ان اعمال کا ذکر کیا گیا ہے جو اخروی سعادت سے ہم کنار کرنے والے ہیں۔ ان میں سے ایک والدین کے ساتھ حسن سلوک ہے۔

۲۔ آیت میں پہلے توحید اور اطاعتِ الٰہی کا بیان ہے، اس کے فوراً بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا درجہ کتنا بلند ہے۔

---

(۱) زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۲/ ۴۴۳

(۲) قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۰/ ۲۳۷

(۳) رازی، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر: ۱۰/ ۱۵۱-۱۵۲؛ ابوحیان، البحر المحیط

۳۔ لفظ 'والدین' کو لفظ 'احساناً' سے پہلے لانے سے اس میں تاکید اور زور پیدا ہو گیا ہے۔

۴۔ لفظ 'احساناً' کو نکرہ لایا گیا ہے، جو عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے کہ والدین کے ساتھ بہت زیادہ اور کامل طریقے سے حسنِ سلوک کرو۔ کیوں کہ جس طرح ان دونوں نے تمہارے ساتھ احسان عظیم کیا ہے اسی طرح تمہارا بھی ان کے ساتھ معاملہ ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود تم ان کا بدلہ پورا پورا نہیں چکا سکتے، اس لیے کہ ان کا احسان تمھارے ساتھ پہلے ہوا ہے اور مثل مشہور ہے کہ پہلے احسان کرنے والے کا بدلہ نہیں چکایا جا سکتا۔(۱)

قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔

سورۂ لقمان میں ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ○ (لقمان: ۱۴)

"اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا۔ میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔"

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (الاحقاف: ۱۵)

"ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔"

ان آیات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، جس میں ماں باپ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۱۰/ ۱۵۲۔ ۱۵۳

دونوں شامل ہیں، اگرچہ ماں کی تکلیفوں اور مشقتوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ وہ دوران حمل بھی مشقت جھیلتی ہے، وضع حمل کے دوران بھی شدید اذیت سے دوچار ہوتی ہے اور پھر پیدائش کے بعد عرصہ تک دودھ پلاتی ہے۔ اسی لیے بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا درجہ باپ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے۔

ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: تمھاری ماں۔ یہ سوال انھوں نے تین بار دہرایا۔ آپؐ نے ہر بار یہی جواب دیا۔ یہی سوال انھوں نے چوتھی بار کیا تو آپؐ نے فرمایا: تمھارا باپ۔(۱)

بوڑھے والدین کے ساتھ حسنِ معاملہ کا خصوصی حکم

والدین کے ساتھ حسن سلوک کا یہ حکم عام ہے۔ لیکن جب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کے حقوق ادا کرنے، ان کی دیکھ بھال کرنے اور ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آنے کا خصوصی حکم دیا گیا ہے۔ بڑھاپا اپنے ساتھ متعدد عوارض لے کر آتا ہے۔ انسان کے جسمانی قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے روزمرہ کے کاموں کی انجام دہی میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ بسا اوقات مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ طبیعت کے خلاف کوئی معمولی کام ہو جائے تو سخت ناگواری ہوتی ہے اور غصہ آ جاتا ہے۔ ایسے موقع پر اولاد کی سعادت مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان کے دست و بازو بنیں، انھیں سہارا دیں، ان کے کام انجام دیں، ان کی ضروریات پوری کریں اور ان کی تنک مزاجی کو برداشت کریں۔ احادیث میں بوڑھے والدین کی خدمت کا درجہ جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر قرار دیا گیا ہے۔

ایک شخص نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں جہاد کے لیے نکلنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا تمھارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ (ان کے ساتھ رہ کر جہاد کرو)(۲) ساتھ رہ کر جہاد کرنے کا

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من احق الناس بحسن الصحبۃ، ۵۹۷۱، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، ۱۔۳

(۲) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب الجہاد باذن الابوین، ۳۰۰۴، ۵۹۷۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، ۵، ۶

مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت کرو۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: میں اللہ تعالیٰ سے اجر کی طلب میں آپ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تمھارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں دونوں زندہ ہیں؟ آپؐ نے اس شخص سے پھر سوال کیا: کیا تم اللہ سے اجر کے طالب ہو؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا:

فارجع الی والدیك فأحسن صحبتهما(۱)

"تب اپنے والدین کے پاس واپس جاؤ اور ان کی اچھی طرح خدمت کرو۔"

جس شخص کو اپنے بوڑھے والدین کی خدمت کی توفیق ملی ہو اسے جنت کی بشارت دی گئی ہے اور جس شخص نے انھیں بڑھاپے میں پایا ہو، پھر بھی ان کی خدمت نہ کی ہو اسے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا: رغم انفه (اس شخص کی ناک غبار آلود ہوئی، یعنی وہ ناکام و نامراد ہوا) حاضرین نے دریافت کیا: کون؟ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپؐ نے جواب دیا:

من أدرك أبويه عند الكبر أو أحدهما ثم لم يدخل الجنة(۲)

"جس نے اپنے ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، پھر بھی جنت میں داخل نہ ہو سکا۔"

الادب المفرد میں اس حدیث کا آخری ٹکڑا 'فدخل النار' کے الفاظ سے ہے، یعنی پھر بھی جہنم میں چلا گیا۔(۳)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، ۲۵۴۹

(۲) حوالہ سابق، ۲۵۵۱

(۳) بخاری، الادب المفرد، باب من ادرک ابویہ فلم یدخل الجنۃ، ۱۰۰

قرآن کریم کا دل کش بیان

بوڑھے والدین کے ساتھ جس طرح کا رویہ مطلوب ہے اور ان کے ساتھ جس طرح پیش آنا چاہیے، اس کی بڑی موثر تفصیل قرآن کریم میں ایک جگہ ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ
وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ○

(بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

''اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ "پروردگار! ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا"

اس آیت کی تشریح میں علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے:

''یہاں خاص طور پر بڑھاپے کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ ایسی حالت ہوتی ہے جس میں والدین اپنے بیٹے کی جانب سے حسن سلوک کے زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں، کیوں کہ کم زوری اور بڑھاپے کی وجہ سے ان کے حالات بدل جاتے ہیں۔ اس لیے اس مرحلے میں ان کی دیکھ بھال کی پہلے کے مقابلے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اس عمر میں ماں باپ کا انحصار پورے طور پر اپنے بیٹے پر ہوتا ہے۔ وہ ضرورت مند ہوتے ہیں کہ ان کا بیٹا ان کے بڑھاپے میں اسی طرح ان کی دیکھ بھال کرے جس طرح اس کے بچپن میں انھوں نے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ آیت میں بڑھاپے کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے بھی کیا گیا ہے کہ آدمی طویل عرصہ تک کسی کے ساتھ رہتا ہے تو عموماً اس کے وجود کو بوجھ سمجھنے لگتا ہے، اس سے اکتا جاتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر

> ناگواری ظاہر کرنے لگتا ہے۔ پھر اگر معاملہ بیٹے اور اس کے ماں باپ کا ہو اور بیٹا ایسا ہو جو ناز نخرے میں پلا ہو اور اس کی دین داری میں بھی کمی ہو تو وہ مختلف معاملات میں اپنے ماں باپ پر غیظ و غضب کا اظہار کرنے لگتا ہے، اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور ان کے ساتھ برتاؤ میں وہ حدِ ادب کو پھلانگ جاتا ہے“۔(۱)

علامہ زمخشریؒ نے آیت کی بلاغت اور اس کے مشتملات کی معنویت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> ”اس آیت میں لفظ 'عندک' (تمھارے پاس رہیں) کے استعمال میں بڑی معنویت پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑھاپے کی اس عمر کو پہنچ جائیں کہ اپنے روزمرہ کے کاموں کی انجام دہی ان کے بس میں نہ ہو، ان کا انحصار پورے طور پر اپنے بیٹے پر ہو جائے، اس کے علاوہ اور کوئی ان کی کفالت کرنے والا نہ ہو، وہ اس کے پاس، اس کے گھر میں اور اس کی کفالت میں ہوں۔ یہ صورت حال بسا اوقات بیٹے پر شاق گزرتی ہے اور وہ بہ دقت اسے برداشت کر پاتا اور اس پر صبر کر پاتا ہے۔ کبھی اسے ان کے ساتھ وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جو وہ اس کے ساتھ اس کے بچپن میں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بیٹے کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ معاملہ کرنے میں خوش اخلاقی، نرمی اور برداشت کا مظاہرہ کرے، یہاں تک کہ اگر کبھی ان کی جانب سے کسی ایسے فعل کا صدور ہو جائے جس سے اس کی طبیعت ابا کرتی ہو یا ان کی کفالت سے وہ بار محسوس کرتا ہو تو بھی ان کے سامنے اس پر ادنیٰ سی ناگواری ظاہر نہ کرے“(۲)

مزید فرماتے ہیں:

> ”اللہ سبحانہ نے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا بہت تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے۔ اس حکم میں کتنا زور پایا جاتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۱۰/۲۳۱

(۲) کشاف: ۲/۳۳۳

> اس کا تذکرہ اپنی عبادت کے حکم کے ساتھ کیا ہے اور دونوں احکام ایک ساتھ دیے ہیں۔ پھر ان کے حسنِ معاملہ کے دائرہ کو اور تنگ کر دیا ہے، چنانچہ اگر ماں باپ کے کسی رویہ یا فعل پر ناگواری کے اسباب و محرکات موجود ہوں اور وقتی ایسے حالات پائے جائیں کہ صبر اور برداشت کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جا تا ہو، تو بھی بیٹے کو ناگواری کا ایک لفظ منہ سے نکالنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔“ (۱)

ماں باپ کو ’اف‘ نہ کہنے کا مطلب

بوڑھے ماں باپ کے تعلق سے آیت بالا میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ انھیں ’اف‘ نہ کہو۔ ’اف‘ سے مراد زبان سے کوئی ایسا لفظ نکالنا ہے جس سے ناگواری کا اظہار ہوتا ہو۔ (۲) ماہر لغت اصمعی فرماتے ہیں:

> ”’اف‘ اصلاً کان کے میل کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی چیز سے گھن ظاہر کرنی ہو۔ پھر اس کا استعمال ہر اس موقع پر ہونے لگا جب کسی چیز پر ناپسندیدگی اور ناگواری کا اظہار کرنا ہو۔“ (۳)

امام رازیؒ نے لکھا ہے:

> ”’اف نہ کہو‘ یہ ایک تعبیر ہے۔ اسے اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب اذیت پہنچانے والی اور ناگوار معمولی سی بات سے روکنا مقصود ہو۔ اس کے ذریعہ اذیت پہنچانے والی دیگر تمام باتوں اور کاموں سے روک دیا گیا ہے۔ یہ ادنیٰ کے ذریعہ اعلیٰ پر استدلال کے قبیل سے ہے۔ یہ کہہ کر گویا والدین کی انتہائی تعظیم اور ادب کا حکم دیا گیا ہے۔“ (۴)

---

(۱) کشاف، حوالہ سابق

(۲) کشاف، حوالہ سابق، (اف صوت یدل علی تضجر) امام قرطبی نے ابو رجاء العطاردی کی یہ تشریح نقل کی ہے: الاف الکلام القذع الردیء الخفی ویقال لکل ما یضجر ویستثقل (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۲۴۳)

(۳) تفسیر کبیر: ۱۰/ ۱۵۳

(۴) تفسیر کبیر: ۱۰/ ۱۵۵

بدزبانی کی ممانعت

اس آیت میں دوسری بات یہ کہی گئی: وَلَا تَنْهَرْهُمَا یعنی والدین کو جھڑک کر جواب نہ دو۔ علامہ زمخشری نے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

(ولا تنهرهما) ولا تزجرهما عما يتعاطيانه مما لا يعجبك(۱)

”ولا تنهرهما کا مطلب یہ ہے کہ اگر ماں باپ کوئی ایسا کام کریں جو تمہیں پسند نہ ہو تو ان کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ نہ کرو۔“

امام رازیؒ نے لفظ 'نہر' کی یہ تشریح کی ہے:

اظهار المخالفة في القول على سبيل الرد عليه والتكذيب له(۲)

”اس کا مطلب ہے کسی بات پر مخالفت کا اظہار، کہ وہ کچھ کہیں تو اسے رد کر دیا جائے اور انہیں جھٹلا دیا جائے۔“

حضرت علی بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر نبی ﷺ نے چند ایسے اشخاص کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور رہوں گے۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو اپنے ماں باپ کو برا بھلا کہے۔ آپ نے فرمایا:

لعن الله من لعن والديه(۳)

”اللہ کی لعنت ہو اس شخص پر جو اپنے والدین پر لعنت کرے۔“

نرمی اور ادب سے بات کرنے کا حکم

اس آیت میں والدین کے تعلق سے تیسرا حکم یہ دیا گیا کہ ان سے نرمی، محبت اور ادب کے ساتھ بات کی جائے۔ علامہ ابن کثیرؒ نے 'قولا کریما' کی یہ تشریح کی ہے:

---

(۱) کشاف: ۲/ ۴۴۴

(۲) تفسیر کبیر: ۱۰/ ۱۵۵

(۳) صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، ۱۹۷۸

(قولاً کریماً) لیناً طیباً حسناً بتأدب وتوقیر وتعظیم(۱)

"قولاً کریماً سے مراد یہ ہے کہ ان سے ادب، احترام اور تعظیم کے ساتھ نرم، اچھی اور عمدہ گفتگو کی جائے۔"

مشہور تابعی حضرت سعید بن المسیبؒ نے اسے بڑے عمدہ طریقے سے سمجھایا ہے۔ ان کے ایک شاگرد نے ان سے عرض کیا: حضرت! قرآن میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، سب کا مطلب میں نے سمجھ لیا ہے، لیکن وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا سے اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے؟ یہ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ براہ کرم اس کی وضاحت فرما دیجیے۔ انھوں نے جواب دیا: "اس کا مطلب اس انداز سے بات کرنا ہے جس طرح ایک خطا کار غلام اپنے تند خو اور درشت مزاج آقا سے بات کرتا ہے۔"(۲)

غایت درجہ تعظیم اور احترام کی تاکید

چوتھی بات یہ کہی گئی کہ ان کے ساتھ رحمت و شفقت کا معاملہ کیا جائے، ان کا ہر ممکن خیال رکھا جائے، ان کی غایت درجہ تعظیم کی جائے، ان کے ساتھ احترام سے پیش آیا جائے اور ان کے سامنے تواضع اختیار کی جائے۔ اس کے لیے بڑی بلیغ تعبیر (وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ) اختیار کی گئی ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

هذه استعارة فی الشفقة والرحمة بهما والتذلل لهما تذلل الرعية للأمير والعبيد للسادة(۳)

"یہ استعارہ ہے اس بات کا کہ ان کے ساتھ شفقت اور رحم و کرم سے پیش آیا جائے اور ان کے سامنے اس طرح جھک کر رہا جائے جس طرح رعایا اپنے حکمراں کے ساتھ اور غلام اپنے آقا کے سامنے رہتے ہیں۔"

---

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱۳۵۸/۳

(۲) تفسیر قرطبی: ۲۴۳/۱۰

(۳) حوالہ سابق: ۲۴۴-۲۴۳/۱۰

اس آیت میں جو بلاغت پائی جاتی ہے اس کی وضاحت امام قفال نے یوں کی ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے والدین کے سامنے انتہائی تواضع اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی کہ ''ان کے سامنے نرمی اور رحم کے پر جھکا کر رکھو''۔ یہ استعارہ دو پہلوؤں سے ہے۔ اول یہ کہ پرندہ جب اپنے بچوں کو اپنے سے قریب رکھتا ہے تو انھیں اپنے پروں میں سمیٹ لیتا ہے۔ یہ حسن انتظام کا کنایہ ہے۔ گویا بیٹے سے کہا گیا کہ اپنے والدین کی کفالت کرو اور انھیں اپنے پاس رکھ کر اس طرح ان کی دیکھ بھال کرو جس طرح انھوں نے تمہارے بچپن میں تمہارا خیال رکھا تھا۔ دوم یہ کہ پرندہ جب اڑنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے پر پھیلا لیتا ہے اور جب اڑنا نہیں چاہتا تو اپنے پر سمیٹے رہتا ہے۔ گویا پر جھکا کر رکھنا تواضع اختیار کرنے سے کنایہ ہے''۔(۱)

مکمل خدمت گزاری کی تلقین

پانچویں اور آخری بات یہ کہی گئی کہ والدین نے اپنے بیٹے کی، اس کے بچپن میں، پرورش و پرداخت میں جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور مشقتیں جھیلی ہیں، بیٹے کو انھیں یاد رکھنا چاہیے، اسے ان کا سراپا سپاس رہنا چاہیے اور ان کے لیے بارگاہ الٰہی میں دست بدعا رہنا چاہیے۔ علامہ قرطبیؒ نے آیت کے ٹکڑے (وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا) کی شرح میں لکھا ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کریں اور ان کے لیے دعا کرتے رہیں۔ اس نے ہر بندے کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اسی طرح رحم دلی سے پیش آؤ جس طرح وہ تمھارے ساتھ پیش آئے تھے، اسی طرح ان کے ساتھ نرمی برتو جس طرح انھوں نے برتی تھی۔ تم اپنے بچپن میں کم نام اور محتاج تھے، انھوں نے تم کو خود پر ترجیح دی، راتوں میں جاگ جاگ کر تمھاری خدمت کی، خود بھوکے رہ کر تمھیں آسودہ کیا، خود

---

(۱) تفسیر کبیر: ۱۰/ ۱۵۶، البحر المحیط ۶/ ۳۲

بچے رہو کر تمھیں کپڑے پہنائے۔ اب تم انھیں اس کا بدلہ اسی صورت میں دے سکتے ہو کہ جب وہ اپنے بڑھاپے میں اس حال کو پہنچ جائیں جس میں تم اپنے بچپن میں تھے تو تم ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرو جیسا انھوں نے تمھارے بچپن میں تمھارے ساتھ کیا تھا۔ اس کے باوجود انھیں سبقت کا شرف حاصل رہے گا۔"⁽¹⁾

والدین کو خوش رکھنے کی کوشش کی جائے

حقوقِ والدین کے سلسلہ میں قرآن و حدیث میں جو تعلیمات مذکور ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کا ہر حکم بجالایا جائے اور کسی معاملہ میں ان کی مرضی کے خلاف کام نہ کیا جائے، خواہ ان کا حکم طبیعت پر کتنا ہی گراں کیوں نہ ہو اور ان کی مرضی کا کام کرنے میں کتنا ہی نقصان دکھائی دیتا ہو۔

ایک موقع پر حضرت ابو الدرداءؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ان میں سے ایک بات یہ ہے:

وأطِعْ والديك وإن أمراك أن تخرج من دنياك فاخرج لهما⁽²⁾۔

"اپنے ماں باپ کا کہنا مانو، یہاں تک کہ اگر وہ تمھیں حکم دیں کہ تم اپنی دنیا سے نکل جاؤ تو ان کا کہنا مانتے ہوئے نکل جاؤ۔"

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے چند ایسے اشخاص کا تذکرہ کیا جن کی طرف سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنی نگاہ پھیر لے گا اور وہ جنت میں داخلہ سے محروم ہوں گے۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو اپنے والدین کا نافرمان ہو⁽³⁾۔

ایک مرتبہ آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کی ایک مجلس میں ان سے فرمایا: کیا میں تمھیں

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۲۴۳

(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، ۴۰۳۴

(۳) سنن نسائی، کتاب الزکاۃ، باب المنان بما اعطی، ۲۵۶۲۔ اس کی روایت بزار، حاکم اور ابن حبان نے بھی کی ہے۔ علامہ البانی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

'اکبر الکبائر' (سب سے بڑے گناہوں) کے بارے میں نہ بتاؤں؟ پھر آپ نے جو چیزیں گنائیں ان میں سے ایک 'والدین کی نافرمانی' تھی(۱)۔

والدین کا کہنا نہ ماننے کی صرف اسی صورت میں اجازت ہے جب وہ کسی ایسے کام کا حکم دیں جو دینی و شرعی اعتبار سے ناجائز ہو۔ ان کی وہ بات تو نہیں مانی جائے گی، لیکن دیگر معاملات میں ان کے ساتھ حسب سابق خوش گوار تعلق رکھنا اور اچھا برتاؤ کرنا لازمی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمان: ۱۵) (۲)

> ''لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔''

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب مشہور صحابیٔ رسول حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے اسلام قبول کرنے پر ان کی ماں نے سخت ناراضی ظاہر کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ جب تک تم اس نئے دین کو چھوڑ نہیں دوگے میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی(۳)۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ ان کی یہ بات تو نہیں مانی جائے گی، البتہ دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک جاری رکھنا ہے۔ علامہ قرطبی نے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

> ''یہ آیت دلیل ہے اس بات پر کہ اگر ماں باپ کافر ہوں تو بھی اگر وہ ضرورت مند ہوں تو ان کی مالی مدد کی جائے، ان کے ساتھ نرمی سے بات کی جائے اور سہولت کے ساتھ انھیں اسلام کی دعوت دی جائے۔''(۴)

اولاد اگر والدین کی مرضی کے کام کرے گی اور ان کا کہنا مانے گی تو وہ خوش رہیں گے

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر، ۵۹۷۶، صحیح مسلم، کتاب الایمان، ۱۴۳

(۲) یہی مضمون العنکبوت: ۸ میں بھی وارد ہوا ہے۔

(۳) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، ۱۷۴۸

(۴) تفسیر قرطبی: ۱۴/ ۶۵

اور اگر وہ ان کی مخالفت کرے گی اور اس کے کام ان کی مرضی کے خلاف ہوں گے تو انھیں تکلیف اور رنج ہوگا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ والدین کے خوش رہنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور ان کی ناراضی اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث بنتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> رضا الرب تبارك وتعالى في رضا الوالدين وسخط الله تبارك وتعالى في سخط الوالدين(۱)
>
> ”والدین کی رضامندی میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور والدین کی ناراضی میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے۔“

اسلام میں ہجرت اور جہاد دو ایسے اعمال ہیں جن کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ لیکن والدین کے حقوق کی ادائی سے بے پروا ہو کر اور ان کو ناراض کر کے ان کی انجام دہی کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں آپ سے ہجرت پر بیعت کرتا ہوں۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ اس کے والدین زندہ ہیں اور انھیں اس کی جدائی گوارا نہیں ہے، وہ آہ و بکا کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا:

> ارجع إليهما وأضحكهما كما أبكيتهما(۲)
>
> ”ان کے پاس واپس جاؤ، اور جس طرح تم نے انھیں رلایا ہے اسی طرح انھیں ہنساؤ۔“

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے:

> بكاء الوالدين من العقوق والكبائر(۳)
>
> ”بیٹے کا ایسا رویہ جس کی وجہ سے والدین رونے پر مجبور ہو جائیں، ان کی نافرمانی ہے اور اس کا شمار بڑے گناہوں میں ہوگا۔“

---

(۱) منذری، الترغیب والترہیب: ۲/ ۹۳۶ بحوالہ بزار۔ علامہ البانی نے اسے حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، ۲۵۲۸؛ سنن النسائی، ۴۱۶۳؛ سنن ابن ماجہ، ۲۷۸۲

(۳) بخاری، الادب المفرد، باب بکاء الوالدین، ۳۱۔

والدین کی معاشی ضروریات کی تکمیل

والدین کے حقوق کی ادائی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی مالی ضروریات پوری کی جائیں اور انھیں محتاجی کی حالت میں نہ چھوڑ دیا جائے۔ عہد نبوی میں لوگوں نے دریافت کیا کہ وہ کیا خرچ کریں اور کس حد تک خرچ کریں؟ اس کے جواب میں مقدار متعین کرنے کے بجائے مدات صرف کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان میں سرِ فہرست والدین کو رکھا گیا:

> يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ:۲۱۵)
>
> ”لوگ پوچھتے ہیں: ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔“

عموماً آدمی بیوی بچوں کی کفالت میں مصروف رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ والدین پر خرچ کرنے سے اس کا مال کم اور ہاتھ تنگ ہو جائے گا۔ اس لیے والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی کفالت کرنے والے کی روزی میں کشادگی کی خوش خبری دی گئی ہے:

> حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
>
> من سرہ ان یمد لہ فی عمرہ ویزاد فی رزقہ فلیبر والدیہ ولیصل رحمہ(۱)
>
> ”جو شخص چاہتا ہو کہ اس کی عمر میں اضافہ ہو اور اس کا رزق بڑھا دیا جائے، اسے چاہیے کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔“

---

(۱) مسند احمد

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے باپ کی شکایت کی: اے اللہ کے رسول، میرے پاس کچھ مال ہے، لیکن میرے بچے بھی ہیں، میرا باپ میرا مال خرچ کرنا چاہتا ہے۔ میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا:

انت ومالك لابيك(۱)

”تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے۔“

دوسری روایت میں اس کے ساتھ یہ اضافہ بھی ہے کہ آپؐ نے باپ کو مخاطب کرکے فرمایا:

إنّ أولادكم من أطيب كسبكم، كلوا من كسب أولادكم(۲)

”تمھاری اولاد تمھاری اچھی کمائی میں سے ہے۔ تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھا سکتے ہو۔“

بعض سندوں سے یہ حدیث مفصل مروی ہے۔ اس میں ہے کہ بیٹے کی شکایت پر آپؐ نے اس کے باپ کو بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کے سامنے بیٹے کی شکایت بیان کی۔ اس پر اس نے رو رو کر اپنا دکھڑا سنایا کہ جب وہ جوان اور اس کا بیٹا بچہ تھا تو اس نے اسے پال پوس کر بڑا کیا، اس کے لیے مشقتیں جھیلیں، اس پر اپنی کمائی خرچ کی، کیا اب اسے اتنا بھی حق نہیں کہ اس کی کمائی میں سے اپنی ضرورت بھر کا مال لے لے۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کی گفتگو سن کر آں حضرت ﷺ بھی آب دیدہ ہوگئے(۳)

ایک دوسری حدیث ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ ان سے کسی نے دریافت کیا: میری کفالت میں ایک بچہ ہے، کیا میرے لیے اس کے مال میں سے کھانا جائز ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے:

إنّ من أطيب ما أكل الرجل من كسبه، وولده من كسبه(۴)

---

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب ما للرجل من مال ولدہ، ۲۲۹۱

(۲) سنن ابی داود، کتاب البیوع، باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ، ۳۵۳۰؛ سنن نسائی، ۴۲۵۰؛ سنن ابن ماجہ، ۲۲۹۲

(۳) تفسیر قرطبی، تفسیر سورۂ اسراء آیت ۲۴

(۴) سنن ابی داود، کتاب البیوع، باب الرجل یاکل من مال ولدہ، ۳۵۲۸، سنن النسائی، ۴۴۴۹، سنن ابن ماجہ، ۲۲۹۰

"آدمی کا سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو وہ اپنی کمائی میں سے کھائے اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی میں سے ہے۔"

علامہ شوکانی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

"اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اپنے بیٹے کے مال میں شریک ہے۔ اس کے لیے اس میں سے لینا جائز ہے، چاہے بیٹا اجازت دے یا نہ دے اور اس کے لیے اس میں اسی طرح تصرف کرنا جائز ہے جیسے وہ اپنے مال میں کرتا ہے۔ البتہ ضروری ہے کہ وہ اس میں سے بس بہ قدر ضرورت خرچ کرے، بے دردی سے نہ اڑائے۔"(۱)

والدین کے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے

والدین کے معاملے میں صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ان کی معاشی ضروریات کی تکمیل کردی جائے اور ان کے مادی تقاضے پورے کردیے جائیں۔ یوں بھی عمر رسیدہ افراد کی مالی اور مادی ضروریات بہت محدود ہو جاتی ہیں۔ ان کی تو بس یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ان کے پاس کچھ وقت گزارے، ان سے باتیں کرے اور ان کی باتیں سنے، ان سے ہمدردی، اپنائیت اور محبت کا اظہار کرے، ان کی تکلیفوں کا ازالہ کرے اور انھیں آرام پہنچائے۔ اسلام کی مجموعی تعلیمات سے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اوپر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ کا حوالہ آچکا ہے (إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا......) اس میں لفظ 'عِنْدَكَ' (تمھارے پاس) سے اشارہ ملتا ہے کہ آدمی کو ایسی تدبیر اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جس سے اس کے والدین اس کے پاس رہیں، یا وہ خود ان کے پاس کچھ وقت گزارے۔

اسلامی تعلیمات کے اثرات

والدین کے بارے میں اسلام کی انھی تعلیمات کا اثر تھا کہ اسلامی تاریخ کے کسی دور

---

(۱) شوکانی، نیل الاوطار: ۵/ ۳۹۱

میں مسلم معاشرہ میں والدین کے حقوق سے غفلت اور بے اعتنائی نہیں برتی گئی اور مسلم حکمرانی کے کسی دور میں کسی ملک میں بوڑھوں کے عافیت کدے قائم کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ موجودہ زمانے میں بھی عمر رسیدہ افراد کی حالتِ زار کی جو صورت حال عالمی اور ملکی دونوں سطحوں پر نظر آتی ہے، اس میں مسلمانوں کا تناسب بہت معمولی ہے۔

ہندوستان میں اولڈ ایج ہومس کے ایک سروے کے مطابق ۱۹۹۵ء میں ہندوستان میں ۵۲۹ ہومس تھے۔ ان میں سے صرف ایک، کیرالا کے ضلع کوزی کوڈ میں، مسلمانوں کے زیر انتظام تھا، جب کہ ۲۱۶ کا نظم مسیحی ایجنسیاں کرتی تھیں، جن میں سے ۸۲ صرف کیرالا میں تھے۔ اس زمانے میں کیرالا میں کل اولڈ ایج ہومس کی تعداد ۱۰۲ تھی۔ اس سروے میں ۳۰۱۵ افراد کو شامل کیا تھا۔ ان میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۲۶ (۱۱ مرد، ۱۵ عورتیں) تھی۔

اسلام اولڈ ایج ہومس کے قیام کا مخالف نہیں ہے

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام اولڈ ایج ہومس کا مخالف ہے اور وہ خدمتِ خلق کے اس کام کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ بسا اوقات ایسے حالات پیش آسکتے ہیں کہ کوئی مرد یا عورت بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے اور وہ بے سہارا ہو۔ لاولد ہونے کی وجہ سے کوئی اس کی کفالت اور خبر گیری کرنے والا نہ ہو، یا اس کی اولاد ہو مگر اس سے الگ کہیں دور رہتی ہو، یا اس کے پاس ہی ہو مگر اپنی نالائقی کی وجہ سے اس کی صحیح دیکھ بھال نہ کرتی ہو، وغیرہ۔ ایسے لاچار، مجبور اور بے سہارا مردوں اور عورتوں کی خبر گیری کرنا، ان کے کام آنا اور ان کے لیے رفاہی ادارے قائم کرنا اسلام کے نزدیک مطلوب اور اس کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

> خیر الناس أنفعهم للناس(۱)
>
> ”لوگوں میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جس سے دوسرے انسانوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے۔“

☆ ☆ ☆

---

(۱) عبد الرؤف المناوی، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر: ۳/ ۴۰۹۱

پلاسٹک سرجری

طب کی ایک شاخ جس میں جسم انسانی کے کسی عضو کی ہیئت یا فعل کو درست کرنے کے لیے ایک خاص طرح کا آپریشن کیا جاتا ہے، پلاسٹک سرجری (Plastic Surgery) کہلاتی ہے۔ ‘پلاسٹک’ یونانی لفظ Plastikos سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کو موڑنا، اسے نئی شکل دینا to shape,to mold (اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ سرجری کی اس قسم میں مخصوص کیمیاوی مادہ ‘پلاسٹک’ کا استعمال ہوتا ہے۔)

تاریخی پس منظر

انسان فطری طور پر چاہتا ہے کہ وہ صحت مند رہے، اسے کوئی بیماری لاحق نہ ہو، اس کے اعضائے بدن ٹھیک طریقے سے کام کرتے رہیں، ان کے افعال میں کوئی نقص وخلل واقع نہ ہو، ظاہری طور پر بھی ان میں کوئی عیب دکھائی نہ دے اور اس کی شخصیت پرکشش اور جاذب نظر معلوم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی سبب سے اس کے کسی عضو میں بدہیئتی پیدا ہو جائے تو وہ اس کے ازالے کی کوشش کرتا ہے اور اگر وہ عضو اپنا مفوضہ کام کرنا بند کر دے یا اس میں کمی آ جائے تو اسے درست کرنے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔

دنیا کی تمام قوموں میں علاج معالجہ کی جن اولین تدابیر کا سراغ ملتا ہے ان میں اس پہلو کے بھی اشارے پائے جاتے ہیں۔ مورخین کے مطابق ہندوستان میں دو ہزار سال قبل مسیح اس عمل کا پتا چلتا ہے۔ مشہور ہندوستانی طبیب سشرت (Sushruta) نے (جس کا زمانہ چھٹی

صدی قبل مسیح بتایا جاتا ہے) پلاسٹک سرجری کے میدان میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ قدیم مصری طب میں بھی چہرے کے عمل جراحی سے متعلق بعض تفصیلات ملتی ہیں۔ اسی طرح پہلی صدی قبل مسیح میں رومی طب میں اس مخصوص عمل جراحی کی سادہ تکنیک کا سراغ ملتا ہے۔ یہ لوگ زخمی اور کٹے ہوئے کان کی اصلاح اور درستگی کا کام انجام دیتے تھے۔ اس طریقۂ علاج میں ہندوستانی اطباء کی مہارت سے دیگر ممالک میں بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ سسرت اور چرک (Charaka b.300BC) کی طبی تصانیف کا عباسی عہد خلافت میں عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان سے عرب اطباء واقف ہوئے، پھر یہ ترجمے یورپ پہنچے تو ان سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اٹلی میں Brance Family of Sicily (15th Century) اور Gaspare TagliaCozzi (Bologna) سسرت کی تکنیک سے بخوبی آگاہ تھے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کچھ برطانوی طبیبوں نے ہندوستان کا سفر کیا تاکہ ناک کی پلاسٹک سرجری کا مشاہدہ کریں، جو یہاں مقامی طریقوں سے انجام دی جاتی تھی۔ اس کی رپورٹیں Gentleman's Magazine میں شائع ہوئیں۔ اسی طرح پلاسٹک سرجری کے مقامی طریقوں کا مطالعہ کرنے کے لیے Joseph Constantine Carpue (1764-1846) نے ہندوستان میں بیس سال گزارے۔ چوں کہ عمل جراحی میں بہت زیادہ خطرات تھے، خاص طور سے اس صورت میں جب معاملہ سر اور چہرے کا ہو، اس لیے ناگزیر حالت ہی میں اس کو انجام دیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی میں پلاسٹک سرجری کو کچھ زیادہ رواج ملا اور اس میدان میں نئی نئی تکنیکیں ایجاد ہوئیں اور نئے نئے تجربات کیے گئے۔ اس کا اندازہ درج ذیل تجربات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جنھیں اس میدان کے اہم سنگ ہائے میل کہنا بے جا نہ ہوگا۔

۱۸۱۵ء میں Joseph Carpue نے ایک برطانوی فوجی آفیسر کی پلاسٹک سرجری کی، جو mercury treatment کے منفی اثرات کے نتیجے میں ناک گنوا بیٹھا تھا۔

۱۸۱۸ء میں جرمن سرجن Carl Ferdinand Von Graefe (1787-1840) نے اپنی کتاب Rhinoplastic شائع کی۔ اس میں اس نے اطالوی طریقۂ جراحی

میں تبدیلی کرتے ہوئے Original Delayed Pedicle Flap کے بجائے بازو کی کھال لگانے (Free Skin graft) کا طریقہ ایجاد کیا۔

۱۸۲۷ء میں امریکن سرجن Dr. John Peter Mattauer (1787-1875) نے اپنے ہی تیار کردہ آلات سے تالو میں شگاف (Cleft Palate) کا پہلا آپریشن کیا۔

۱۸۴۵ء میں Johann Friedrich Dieffenbach (1792-1847) نے ناک کی پلاسٹک سرجری پر ایک مبسوط تحریر لکھی، جس کا عنوان Operatiue Chirurgie تھا۔ اس میں اس نے اصلاح شدہ ناک کے جمالیاتی منظر کو بہتر بنانے کے لیے دوبارہ آپریشن کا تصور پیش کیا۔

۱۸۸۹ء میں امریکن سرجن George Monks (1853-1933) نے درمیان میں پچکی ہوئی ناک (Saddle nose) کے نقص کو دور کرنے کے لیے دوسرے مقام کی ہڈی استعمال کرنے (Heterogeneous free bone grafting) کا کامیاب تجربہ کیا۔

۱۸۹۱ء میں کان، ناک اور حلق کے امراض کے امریکی ماہر John Orlando Roe (1848-1915) نے ایک نوجوان خاتون کی ناک کے پچھلے ابھار کو کم کرنے کے لیے آپریشن کیا۔

۱۸۹۲ء میں Robert weir نے پچکی ہوئی ناک (Sunken nose) درست کرنے کے لیے بطخ کے سینے کی ہڈی (Duck sternum) استعمال کرنے کا تجربہ (Xenograft) کیا، لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ملی۔

۱۸۹۶ء میں جرمن سرجن Jemes Adolf Israel(1848_1926) نے امریکن سرجن George Monks کے مثل ناک کے نقص کو دور کرنے کے لیے دوسرے مقام کی ہڈی استعمال کی۔

۱۸۹۸ء میں جرمن آرتھوپیڈک سرجن Jacques Joseph (1843-1907) نے ناک کے ابھار کو کم کرنے (Reduction Rhinoplasty) کا پہلا تجربہ شائع کیا۔

نیا زمانہ، نئے مسائل

پلاسٹک سرجری کے میدان میں بیسویں صدی میں غیر معمولی پیش رفت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ برطانوی فوجی Walter Yeo غالباً پہلا شخص ہے جس کے چہرے کی ۱۹۱۷ء میں Skin graft کے ذریعہ کامیاب سرجری کی گئی۔

جنگ عظیم اول (۱۹۱۴-۱۸ء) اپنے ساتھ بھیانک تباہی لائی۔ بہت سے لوگ اس میں ہلاک ہوئے اور ان سے کہیں زیادہ تعداد میں زخمی ہوئے۔ بہت سے فوجی ہاتھ پیر سے معذور ہو گئے۔ ان کے بدن اور چہرے جھلس گئے۔ اس موقع پر بہت سے ممالک میں پلاسٹک سرجری کے کامیاب تجربے ہوئے۔ یہی صورت حال جنگ عظیم دوم (۱۹۳۹-۴۵ء) کے بعد بھی پیش آئی۔

نیوزی لینڈ کے سرجن ماہر امراض کان و حلق Sir Harold Delf Gillies (1882-1960) نے ان لوگوں کے لیے، جن کے چہروں پر جنگ عظیم اول کے درمیان گہرے زخم آئے تھے اور وہ مسخ ہو گئے تھے، جدید پلاسٹک سرجری کے بہت سے طریقوں کو ترقی دی۔

امریکہ میں Dr.Vilray Papin Blair (1871-1955) نے جنگ عظیم اول کے فوجیوں کے جبڑوں اور چہروں کو لاحق ہونے والے پیچیدہ زخموں Complex Maxillofacial injuries کے کامیاب آپریشن کیے۔ اس کی کوششوں سے امریکی ملٹری ہاسپٹل میں پلاسٹک سرجری کا مستقل شعبہ قائم ہوا، جس کے بعد برطانیہ، فرانس، کناڈا اور دیگر ممالک میں بھی اس طرح کے شعبے قائم ہوئے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد نیوزی لینڈ کے سرجن Sir Archibald McIndoe (1900-1960) نے جو Sir Harold کا شاگرد تھا، Royal Air Force کے فوجیوں کا ابتدائی علاج کیا، جن کے بدن جھلس گئے تھے۔

امریکہ میں چہرے کی سرجری اور پلاسٹک سرجری سے متعلق ایک انجمن قائم ہوئی جس کا نام تھا: American Association of Oral and Plastic Surgery

بعد میں یہ انجمن دو ذیلی انجمنوں میں تقسیم ہو گئی:

(1) American Association of Plastic Surgeons
(2) American Assocation of oral and Maxillofacial Surgeons

ان تمام کوششوں اور خدمات کے باوجود پلاسٹک سرجری طب کا ایک مخصوص اور محدود شعبہ تھا، جس کے تحت جسمانی عیوب و نقائص کی اصلاح کی جاتی تھی۔ جنگوں اور حادثات و آفات کے مواقع پر تو پلاسٹک سرجری کے ضرورت مند متاثرین کی تعداد بڑھ جاتی تھی، لیکن عام حالات میں ایسے مریضوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی، لیکن جب سے اس میں ایک نئے ذیلی شعبے کو متعارف کرایا گیا، جس کا مقصد انسان کے ظاہری حسن و جمال میں اضافہ تھا، اس وقت سے یہ شعبہ کافی مقبول ہو گیا۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دیکھنے میں اچھا لگے، اس کا چہرہ خوب صورت معلوم ہو، اس کے اعضاء چست دکھائی دیں اور ان پر درازیٔ عمر کے اثرات عیاں نہ ہوں۔ اس نئے شعبے سے ان کی یہ خواہشات پوری ہوتی نظر آئیں۔ مختلف ممالک میں مختلف سطحوں پر منعقد ہونے والے حسن کے مقابلوں، فلمی دنیا کی چمک دمک، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دل فریب (Glamorous) زندگی اور دیگر عوامل و محرکات نے پلاسٹک سرجری سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد میں سیکڑوں گنا اضافہ کر دیا اور اس فن نے بہت زیادہ منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جس کے مطابق ۲۰۰۶ء میں صرف امریکہ میں پلاسٹک سرجری کے تقریباً گیارہ ملین آپریشن کیے گئے۔ پھر جب پلاسٹک سرجری کاروبار بن گئی تو اس کی خواہش رکھنے والے یہ تلاش کرنے لگے کہ کہاں کم سے کم خرچ پر یہ آپریشن کرائے جا سکتے ہیں۔ اس کے لیے کیوبا، تھائی لینڈ، ارجنٹائنا، ہندوستان اور مشرقی یورپ کے بعض ممالک کی نشان دہی کی گئی۔ آپریشن، آپریشن ہے۔ اس میں بہت سے خطرات پائے جاتے ہیں اور بہت سی پیچیدگیوں کا اندیشہ رہتا ہے۔ لیکن ان سے بے پروا ہو کر ایک دوڑ لگی ہوئی ہے اور اس فن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

مقاصد اور میدانِ عمل

مقاصد کے اعتبار سے پلاسٹک سرجری کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

الف۔ اصلاحی عمل جراحی (Reconstructive Surgery)

پلاسٹک سرجری کا مقصد بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ جسم میں پائے جانے والے کسی ایسے عیب یا نقص کو دور کیا جائے جس سے انسان دیکھنے میں بدہیئت نظر آ رہا ہو، یا کسی ایسے عضو کی کارکردگی کو بحال کیا جائے یا بہتر بنایا جائے جس کی منفعت ختم یا کم ہو گئی ہو۔ یہ عیب یا نقص خلقی (Congenital) بھی ہو سکتا ہے اور حادثاتی (Accidental) بھی۔

جن صورتوں میں اس قسم کی سرجری کی ضرورت پڑتی ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

- پیدائشی نقائص (Congenital abnormalities)، جیسے ہونٹ کا کٹا ہونا (Cleft lip)، تالو کا کٹا ہونا (Cleft Palate)، کان کا بیرونی حصہ نہ ہونا۔ سر کی ہڈیوں کا باہم ملا ہونا (Craniosynostosis)، ہاتھ کے پیدائشی نقائص (Congenital hand deformities)
- بچوں کی نشوونما کے نقائص (Developmental Abnormalities)
- چوٹ لگنے کی وجہ سے پہنچنے والے زخم، جیسے سر اور چہرے کی ہڈیوں کا ٹوٹ جانا (Craniofacial Skeleton Fracture)
- جسم کا جھلس جانا (Burns)
- ٹیومر یا کینسر، جیسے پستان کا کینسر (Breast Cancer)، سر یا گردن کے کینسر (Craniocervical Cancer)، جلد کا کینسر (Skin Cancer)
- گنجا پن (Baldness)

ب۔ تجمیلی عمل جراحی (Cosmetic or Aesthetic Surgery)

بسا اوقات پلاسٹک سرجری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اعضاء کی ساخت میں مناسب تبدیلی کر کے انسان کی ظاہری ہیئت کو خوب صورت اور پرکشش بنایا جائے۔ اسی طرح عمر ڈھلنے کے

ساتھ انسان کے اعضاء میں ڈھیلا پن اور کچھ بدہیئتی آجاتی ہے۔ پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سرجری کی اس قسم کے ذریعے جو افعال انجام دیے جاتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

- پیٹ کا ڈھیلا پن دور کرنا (Abdominoplasty)
- ڈھلک جانے والے پلکوں کو نئی شکل دینا (Blepharoplasty)
- چھوٹے پستان کو بڑا کرنا (Breast Augmentation)
- بڑے پستان کو چھوٹا کرنا (Breast Reduction)
- پستانوں کا ڈھیلا پن کم کرکے انھیں اوپر اٹھانا یا نئی شکل دینا (Mastopexy)
- کولہوں کو اوپر اٹھانا (Buttock Augmentation)
- ناک کو نئی شکل دینا (Rhinoplasty)
- کان کو نئی شکل دینا (Otoplasty)
- چہرے سے جھریاں اور بڑھاپے کی علامات دور کرنا (Rhytidectomy)
- ٹھوڑی کو اوپر اٹھانا (Chin Augmentation)
- رخسار کو اوپر اٹھانا (Cheek Augmentation)
- جلد کو خوب صورت بنانا (Laser skin resurfing)
- مردوں کا سینہ کشادہ کرنا (Male Pectoral Implant)
- چہرے سے مہاسے، چیچک کے داغ اور دیگر نشانات ختم کرنا (Chemical Peel)
- ہونٹ کو نئی شکل دینا (Labia Plasty)
- جسم سے چربی کم کرنا (Suction-Assisted Lipectomy)

سرجری کا طریقۂ کار

پلاسٹک سرجری کے لیے عموماً درج ذیل طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے:

- اعضاء کے عیب یا نقص کو دور کرنے کے لیے آپریشن کیے جاتے ہیں۔
- موٹے لوگوں میں بدن سے زائد چربی کو زائل کرکے انھیں دبلا اور چھریرا بنایا جاتا ہے۔
- بدن کے دوسرے حصوں سے چربی کو منتقل کرکے کولہے ابھارے جاتے ہیں۔
- جسم جھلس جانے کی صورت میں لیفی انسجہ (Fibrous tissues)، جن میں بہت زیادہ کھنچاؤ ہوتا ہے، انھیں آپریشن کرکے نکال دیا جاتا ہے اور صحیح جلد کو ملا کر جوڑ دیا جاتا ہے۔
- جلد کو خوب صورت بنانے کے لیے Laser Technique سے مدد لی جاتی ہے۔
- ایک عام اور اہم طریقہ Microsurgery کہلاتا ہے۔ اس میں کسی عضو کے نقص کو چھپانے کے لیے جلد، عضلہ، ہڈی یا چربی کے نسیج (Tissue) کو دوسری جگہ سے متاثرہ جگہ تک منتقل کیا جاتا ہے اور وہاں کی عروق دمویہ کو جوڑ کر خون کی سپلائی جاری کر دی جاتی ہے۔ یہ تکنیک جلد کی منتقلی کے سلسلے میں کثرت سے مستعمل ہے۔ اسے Skin grafting کہتے ہیں۔

حل طلب مسائل

پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں درج بالا تفصیلات کی روشنی میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں، جنھیں شریعت اسلامی کی روشنی میں حل کیا جانا موجودہ دور کا اہم تقاضا ہے۔ وہ سوالات درج ذیل ہیں:

۱۔ کوئی ایسا عیب جو انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہو اور اس کی وجہ سے وہ بدہیئت نظر آ رہا ہو اور وہ عیب عام قانون فطرت کے خلاف ہو، کیا اس کو دور کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا جائز ہوگا؟

---

(۱) اس موضوع پر تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے:

Santoni-Rugiu, Paolo. A History of Plastic Surgery, Springer, 2007

Haiken, Elizabeth. Venus Envy: A History of Cosmetic Surgery. Johns Hopkins University Press, 1997

۲۔ کوئی ایسا عیب جو پیدائشی طور پر نہ ہو، بلکہ کسی حادثہ کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہو اور اس کی وجہ سے انسان بدہیئت معلوم ہو رہا ہو، کیا اس کے علاج کیلئے پلاسٹک سرجری کرانا درست ہوگا؟

۳۔ جسم انسانی کی بعض ہیئتیں عام قانون فطرت کے خلاف نہیں ہوتیں اور ان کا شمار عیب میں نہیں کیا جاتا، لیکن بعض افراد کو وہ پسند نہیں ہوتیں۔ اسی طرح بعض ہیئتیں بعض افراد کو پسند ہوتی ہیں، لیکن وہ ان کے بدن میں نہیں پائی جاتیں۔ کیا ناپسندیدہ ہیئتوں کو زائل کرنے اور پسندیدہ ہیئتوں کو حاصل کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا جائز ہے؟

۴۔ بعض عیوب یا ناپسندیدہ ہیئتیں عمر زیادہ ہونے کے ساتھ فطری طور پر ہر شخص کے بدن میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کیا ان عیوب یا ہیئتوں کے ازالہ کے لیے آپریشن کرانا جائز ہے؟

۵۔ کیا کم عمر اور خوب صورت نظر آنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرائی جا سکتی ہے؟

۶۔ شناخت چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانے کا کیا حکم ہے؟

اسلام کی اصولی تعلیمات

مذکورہ مسائل کا تجزیہ کرنے اور شریعت اسلامی میں ان کا حکم دریافت کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی بعض اصولی تعلیمات پیش نظر رکھی جائیں، کیوں کہ ان کی روشنی میں ان مسائل کا حل دریافت کرنا اور ان کا حکم مستنبط کرنا آسان ہوگا۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے (لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ التین: ۴) اس نے انھیں ہاتھ، پیر، دل، دماغ، زبان، ہونٹ، آنکھ، کان، ناک اور دیگر اعضائے بدن سے نوازا ہے، تاکہ وہ انھیں کام میں لائیں اور اللہ کا شکر ادا کریں۔ اعضائے بدن اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں اور اس امانت کی حفاظت کرنا ان پر فرض ہے۔ ان اعضائے بدن کے جو مفوضہ کام ہیں اگر ان میں کوئی خلل کسی خلقی بیماری کی وجہ سے یا حادثاتی طور پر واقع ہو تو اسے دور کرنا شریعت میں مطلوب

ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ کچھ بدو خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم علاج معالجہ کر سکتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا:

نعم یا عباد اللہ تداووا فان اللہ لم یضع داءً الا وضع له شفاءً (او قال دواءً)(۱)

"ہاں، اے اللہ کے بندو، علاج کراؤ، اس لیے کہ اللہ نے جو بیماری بھی پیدا کی ہے اس کے لیے شفا (یا فرمایا: دوا) بھی رکھی ہے۔"

۲۔ جس طرح بیماری یہ ہے کہ جسم انسانی کا کوئی عضو کلی یا جزئی طور پر اپنا مفوضہ کام کرنا بند کر دے، اسی طرح بیماری یہ بھی ہے کہ انسان دیکھنے میں کسی خاص وجہ سے بدہیئت نظر آئے۔ بدہیئتی سے اگرچہ انسان کو کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہوتی، لیکن اس سے جو ذہنی اور نفسیاتی تکلیف پہنچتی ہے، وہ جسمانی تکلیف سے کسی طرح کم نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات اس کی اذیت جسمانی اذیت سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ یہ دونوں طرح کی بیماریاں پیدائشی بھی ہو سکتی ہیں اور کسی حادثہ کے نتیجے میں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ شریعت نے علاج معالجہ کے سلسلے میں بیماریوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے، بلکہ ہر طرح کی بیماری کا مداوا کرنے کا حکم دیا ہے۔

۳۔ کائنات کے دیگر مظاہر کی طرح انسانوں کی تخلیق میں بھی اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ (الجاثیۃ: ۴) ان نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو ایک ہیئت پر نہیں پیدا کیا ہے۔ ان کی تخلیق میں پائے جانے والے فرق اس کی خلاقی پر دلالت کرتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں تشبہ سے منع کیا گیا ہے۔ تشبہ کا مطلب ہے دوسرے جیسا بننے کی کوشش کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

لعن رسول اللہ ﷺ المتشبهين من الرجال بالنساء

---

(۱) جامع الترمذي، ابواب الطب، باب ما جاء في الدواء والحث عليه، ۲۰۳۸، سنن أبي داؤد، كتاب الطب، باب في الرجل يتداوى، ۳۸۵۵۔ اس مضمون کی مزید احادیث کے لیے ملاحظہ کیجیے موطا امام مالک: ۲۹۹۲، صحیح بخاری: ۵۶۷۸، صحیح مسلم: ۲۲۰۴، مسند احمد: ۱/ ۳۷۷، ۴۱۳، ۴۴۳، ۲/ ۲۷۸، ۴۲۷، ۵/ ۲۰۱، ۳۷۱

والمتشبهات من النساء بالرجال[1]

''رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں سے مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔''

مذکورہ بالا حدیث میں تشبہ کی صرف ایک صورت کا تذکرہ ہے۔ اس طرح کی دیگر اور بھی جو مشابہتیں ہو سکتی ہیں، وہ شریعت میں مذموم اور ناپسندیدہ ہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش کرنے کو اسلامی شریعت میں سخت ناپسندیدہ اور شیطانی تحریک کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے کہ شیطان نے بارگاہ الٰہی میں لعنتی قرار پانے کے بعد اللہ کے بندوں کو جن طریقوں سے گم راہ کرنے کے منصوبے کا انکشاف کیا تھا ان میں سے یہ بھی تھا: وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (النساء: ۱۱۹) (اور میں انھیں حکم دوں گا تو وہ (میرے حکم سے) خدائی ساخت میں ردو بدل کریں گے)۔ یہ ایک بہت وسیع تعبیر ہے، جس میں انسانی بناوٹ میں تبدیلی لانا بھی شامل ہے[2]

۵۔ انسان اپنی زندگی میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا اس کے سفر زندگی کے اہم مرحلے ہیں۔ یہ مراحل اس فطرت کے عین مطابق ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے۔ قرآن میں اس مظہر کو اللہ کی نشانی کے طور سے پیش کیا گیا ہے۔ (الروم: ۵۴) ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقلی کے ساتھ انسان کے بدن میں کچھ تغیرات واقع ہوتے ہیں۔ یہ تغیرات اللہ تعالیٰ کے طے کردہ قوانین فطرت کا حصہ ہیں۔ انھیں روکنے یا ان میں تبدیلی لانے کی کوشش کرنا بھی تغییر خلق اللہ کے مثل ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب المتشبہون بالنساء والمتشبہات بالرجال، ۵۸۸۵، مزید ملاحظہ کیجیے بخاری: ۵۸۸۶، ۶۸۳۴، ابوداؤد: ۴۰۹۷، ۴۰۹۹، ترمذی: ۲۷۸۳، ابن ماجہ: ۱۹۰۴

[2] اس آیت میں تغییر خلق اللہ سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک قول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت حسن بصریؒ کا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی خلقت میں تبدیلی ہے۔ تمام اقوال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: کتب تفسیر میں متعلقہ آیت کی تفسیر

۶۔ اسلامی شریعت نے انسانوں کے باہمی معاملات میں سچائی اور اظہار حقیقت کو پسندیدہ رویہ قرار دیا ہے اور جھوٹ، مکر و فریب، دھوکہ دہی اور غلط بیانی سے روکا ہے۔

پلاسٹک سرجری کی مختلف صورتوں کے بارے میں شرعی حکم

پلاسٹک سرجری سے متعلق مسائل کا تعلق موجودہ دور کے نئے مسائل سے ہے۔ اس لیے قدیم فقہاء کی تحریروں میں ان سے متعلق احکام صراحت سے نہیں مل سکتے۔ اسلام کی مذکورہ بالا اصولی تعلیمات اور قرآن وحدیث اور قدیم فقہاء کی تحریروں کے اشارات سے ان کے احکام معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ ذیل میں ان میں سے بعض صورتوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

۱۔ خلقی بدہیئتی جو عام قانون فطرت کے خلاف ہو۔

بسا اوقات انسان میں پیدائشی طور پر کوئی ایسا عیب پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی بدہیئتی نمایاں ہوتی ہے اور وہ عیب عام قانون فطرت کے خلاف ہوتا ہے، مثلاً ہونٹ یا تالو کٹا ہوا ہو، ہاتھ یا پیر میں زائد انگلی ہو، منہ میں زائد دانت ہو، یا کوئی دانت زیادہ لمبا ہو، یا اس طرح کا اور کوئی عیب۔ کیا ایسی بدہیئتی کی اصلاح کی جاسکتی ہے؟

قاضی عیاضؒ (م ۵۴۴ھ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو جس طرح بھی پیدا کیا ہو اس کے لیے اپنے اعضاء میں کوئی کمی یا تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے:

> ”جس شخص کے بدن میں کوئی انگلی یا کوئی دوسرا عضو زائد ہو، اس کے لیے اسے کاٹنا یا علیحدہ کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی ہے“ (۱)

یہی بات ابو جعفر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) نے زائد یا لمبے دانت کے سلسلے میں کہی ہے (۲)

یہ حضرات ان کاموں کو اس صورت میں ناجائز کہتے ہیں جب انھیں محض بدہیئتی کو دور کرنے کے لیے انجام دیا جائے۔ البتہ اگر ان کی وجہ سے معمول کے کاموں میں رکاوٹ آرہی

---

(۱) قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۵ / ۳۹۳

(۲) ابن حجر عسقلانی، فتح الباری شرح صحیح البخاری: ۱۰ / ۳۷۷۔

ہو، مثلاً زائد یا لمبے دانت کی وجہ سے کھانے میں دشواری ہوتی ہو، یا زائد انگلی سے کوئی جسمانی اذیت لاحق ہوتی ہو تو ان کے نزدیک انگلی کو کٹوایا اور دانت کو نکلوایا جا سکتا ہے۔ طبری فرماتے ہیں:

> ”اس سے وہ صورت مستثنیٰ ہے جس سے ضرر اور تکلیف لاحق ہوتی ہو، مثلاً کسی عورت کے منہ میں زائد یا لمبا دانت ہو جس سے وہ صحیح طریقے سے کھانا نہ کھا پاتی ہو یا زائد انگلی جس سے اسے اذیت یا تکلیف ہوتی ہو تو اس کے لیے انگلی کٹوانا اور دانت اکھڑوانا بھی جائز ہے۔ اس آخری معاملے میں مرد عورت کے مثل ہے“ (۱)

فقہ حنفی میں یہ شرط نہیں لگائی گئی ہے، البتہ کہا گیا ہے کہ یہ کام اسی وقت کروایا جائے جب اس کی وجہ سے جان کا خطرہ نہ ہو:

> ”اگر کوئی شخص اپنی زائد انگلی یا کوئی دوسرا عضو کٹوانا چاہے تو نصیر فرماتے ہیں کہ اگر اس سے ہلاکت کا اندیشہ ہو تو نہ کرے اور اگر غالب گمان یہ ہو کہ اس سے ہلاک نہیں ہوگا تو اسے کٹوا سکتا ہے“ (۲)

ہمارے خیال میں کسی بدہیئتی کے ازالے کے لیے محض جسمانی اذیت اور دشواری ہی کی شرط نہ ہو، بلکہ ذہنی اور نفسیاتی اذیت کو بھی اسی درجے میں رکھا جانا چاہیے۔ چوں کہ بدہیئتی عام قانون فطرت کے خلاف ہوتی ہے، اس لیے انسان دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خفت اور سبکی محسوس کرتا ہے۔ اس سے اسے جو ذہنی اور نفسیاتی اذیت محسوس ہوتی ہے وہ جسمانی اذیت سے کم نہیں ہوتی۔ اس لیے اسے اس کے ازالے اور اصلاح کی اجازت دی جانی چاہیے۔

عام قانون فطرت کے خلاف پائی جانے والی بدہیئتی ایک بیماری ہے اور شریعت نے بیماری کا علاج معالجہ کرنے کی نہ صرف اجازت، بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔

۲۔ کسی حادثہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بدہیئتی

یہ بھی ممکن ہے کہ بدہیئتی پیدائشی نہ ہو، بلکہ کسی حادثہ کے نتیجے میں ظاہر ہوئی ہو۔ مثلاً کسی ایکسیڈنٹ میں آدمی کی ناک ٹوٹ گئی، یا کان کٹ گیا، یا گھر میں آگ لگ گئی، جس سے

---

(۱) فتح الباری: ۱۰/ ۳۷۷، وتفسیر قرطبی: ۵/ ۳۹۳

(۲) الفتاوی العالمگیریہ: ۵/ ۳۶۰

اس کی جلد جھلس گئی، یا کسی نے گولی ماردی جس سے بدن کے کسی حصے کا گوشت اڑ گیا، یا اس طرح کی کوئی دوسری صورت ہو۔ اس میں آدمی کے بدن میں عیب پہلے نہیں ہوتا، بلکہ حادثاتی طور پر بعد میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح کے کسی عیب کے 'بیماری' میں شمار کیے جانے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اس لیے اس کے علاج کی اجازت ہوگی۔

غزوۂ خندق کے موقع پر دشمنوں کی جانب سے حضرت سعد بن معاذؓ کو ایک تیر آکر لگا، جس سے ان کے بازو کی ایک رگ زخمی ہوگئی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لیے مسجد نبوی میں خیمہ لگوایا اور ان کے علاج معالجہ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔(۱)

صحابیِ رسول حضرت عرفجہ بن اسعدؓ کی ناک عہد جاہلیت میں ہونے والی جنگ کلاب میں کٹ گئی تھی۔ انھوں نے اس کی جگہ چاندی کی ناک لگوائی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب اس میں بدبو پیدا ہوگئی تو اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں سونے کی ناک بنوانے کا مشورہ دیا تھا۔(۲)

غزوۂ بدر میں حضرت رافع بن مالکؓ کو ایک تیر آکر لگا جس سے ان کی آنکھ زخمی ہوگئی۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ نے اس میں اپنا لعاب دہن لگا دیا اور میرے لیے دعا کی۔ اس کی برکت سے مجھے اس آنکھ میں ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔“(۳)

غزوۂ احد میں ایک نازک موقع پر جو صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوگئے تھے اور انھوں نے اپنے جسموں کو آپ کے لیے ڈھال بنا دیا تھا، ان میں حضرت قتادہ بن النعمانؓ بھی تھے۔ انھیں ایک تیر آکر لگا جس سے ان کی آنکھ باہر آگئی۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میری آنکھ ٹھیک ہوجانے کی دعا کر دیجیے۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: اگر چاہو تو صبر کرو، اس کے بدلے تمھیں جنت ملے گی اور چاہو تو میں تمھارے حق میں اللہ سے دعا کروں کہ تمھاری آنکھ ٹھیک ہوجائے۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جنت

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب، ۴۱۲۲

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الخاتم، باب ما جاء فی ربط الاسنان بالذہب، ۴۲۳۲، مزید ملاحظہ کیجیے جامع ترمذی: ۱۷۷۰، سنن نسائی ۵۱۶۳، ۵۱۶۲۔ علامہ البانیؒ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔

(۳) ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ: ۳/ ۲۹۲، بحوالہ طبرانی

بہترین بدلہ اور گراں قدر عطیۂ الٰہی ہے، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ عورتیں مجھے کانا کہیں گی۔ آپ میرے لیے جنت کی بھی دعا فرمایئے اور آنکھ ٹھیک ہو جانے کی بھی۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ "اللہ کے رسول ﷺ نے میرے لیے دونوں چیزوں کی دعا کی اور میری آنکھ ٹھیک ہو گئی۔"(۱)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی حادثہ کے نتیجے میں کوئی عیب پیدا ہو جائے تو اس کے معاملے میں جسمانی اذیت کی طرح ذہنی اور نفسیاتی اذیت کا بھی لحاظ کیا جائے گا۔ چنانچہ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے چیچک کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد اس کے چہرے پر چیچک کے داغ نمایاں ہو گئے ہوں، چہرہ پر کوئی گہرا زخم لگا، جس کے ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی نشانات باقی رہ گئے ہوں، کسی بدمعاش نے چہرے پر تیزاب پھینک دیا، جس کی وجہ سے وہ جھلس کر بدنما ہو گیا ہو، کینسر کی وجہ سے کسی خاتون کا پستان کاٹ کر نکال دیا گیا ہو، ان تمام صورتوں میں مذکورہ بدہیئتی کو دور کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری کی اجازت ہوگی۔

۳۔ بعض جسمانی ہیئتوں کی تبدیلی

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ سب کو ایک شکل و صورت نہیں عطا کی ہے۔ کسی کو کالا بنایا ہے تو کسی کو گورا، کسی کو موٹا بنایا ہے تو کسی کو دبلا، کسی کی ناک اٹھی ہوئی ہے تو کسی کی پچکی ہوئی، کسی کی ٹھوڑی ابھری ہوئی ہے تو کسی کی دھنسی ہوئی، کسی کے کولہے بھاری بھرکم ہیں تو کسی کے دبلے، کسی کا سینہ زیادہ چوڑا ہے تو کسی کا کم۔ عموماً یہ معمولی فرق اعضاء کے مفوضہ افعال کی انجام دہی میں بالکل حارج نہیں ہوتے اور انھیں عام قانون فطرت کے خلاف بھی نہیں تصور کیا جاتا۔ البتہ ان میں سے بعض ہیئتوں کو پسندیدہ خیال کیا جاتا اور انھیں خوب صورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور بعض ہیئتوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پلاسٹک سرجری کے ذریعے مذکورہ ہیئتوں میں تبدیلی کی جا سکتی ہے اور اپنے جسم کو من چاہی ہیئت میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تکنیک سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے اور اس نے ایک زبردست منافع بخش کاروبار کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ سوال پیدا ہوتا

---

(۱) علی بن برہان الدین الحلبی، انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون المعروف بالسیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۲۵۲

ہے کہ اسلامی شریعت اس رجحان کو کس نظر سے دیکھتی اور اس کے بارے میں کیا حکم لگاتی ہے؟

انسان کا جسم اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اللہ نے اعضائے انسانی سے مختلف منفعتیں وابستہ کر رکھی ہیں اور انھیں مخصوص کاموں میں لگا دیا ہے۔ قرآن کریم میں مختلف اعضاء، مثلاً آنکھ، کان، زبان، ہونٹ، ہاتھ، پیر، دل، دماغ وغیرہ کا تذکرہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور انسانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور صرف اسی کی عبادت کریں، جس نے انھیں ان بیش بہا نعمتوں سے نوازا ہے۔ اگر وہ اس کی ناشکری کریں گے اور شرک میں مبتلا ہوں گے تو روز قیامت ان سے باز پرس کی جائے گی۔(۱)

اس سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ انسان اپنے اعضائے جسم کا مالک نہیں ہے کہ ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے، بلکہ اسے صرف انھیں ان کے مفوضہ کاموں میں استعمال کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ اپنے اعضائے جسم کی ہیئتوں میں من مانی تبدیلیاں لانے کے لیے پلاسٹک سرجری کراتے یا کرانا چاہتے ہیں، گویا وہ خود کو اپنے جسم و جان کا مالک و مختار تصور کرتے ہیں اور اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ انھیں اپنی جن پسندیدہ ہیئتوں میں ڈھالنا چاہیں، ڈھال لیں۔ یہ تصور صحیح اسلامی تصور کے مغایر ہے۔ اس لیے شرعی نقطۂ نظر سے اسے جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اس سے صرف ایک صورت مستثنیٰ ہے اور وہ یہ کہ کسی عضو کی کوئی ہیئت عام قانون فطرت کے خلاف ہو، یا اس سے اس کے مفوضہ کاموں کی انجام دہی میں دشواری یا رکاوٹ آرہی ہو۔ مثلاً کسی شخص کے دانت بہت زیادہ باہر کی طرف نکلے ہوئے ہوں، جس سے منہ ٹھیک طریقے سے بند نہ ہوتا ہو، یا کھانا صحیح طریقے سے چبایا نہ جاتا ہو، یا چہرہ بدنما معلوم ہوتا ہو۔ اس کا شمار بیماری میں ہوگا اور پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس کی درستگی کی اجازت ہوگی۔

۴۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ظاہر ہونے والی ہیئتیں

انسان اپنی زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ وہ ایک مختصر اور نحیف جسم لے

---

(۱) ملاحظہ کیجیے آیات: الانعام: ۴۶، الاعراف: ۱۷۹، ۱۹۵، النور: ۲۴، الحج: ۴۶، یٰس: ۶۵، ۳۴، ق: ۳۷، البلد: ۸۔۹ وغیرہ۔

کر پیدا ہوتا ہے۔ پرورش و پرداخت کے نتیجے میں اس کے اعضاء کا حجم بڑھتا ہے۔ ان میں طاقت اور چستی پیدا ہوتی ہے، یہاں تک کہ جوانی میں وہ ہر پہلو سے مکمل ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کا انحطاط شروع ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی طاقت کم ہوتی جاتی ہے اور چستی کی جگہ ڈھیلا پن بڑھنے لگتا ہے، یہاں تک کہ بڑھاپے میں وہ کمزوری اور بے بسی کی اسی حالت کو پہنچ جاتا ہے جس سے اپنے بچپن میں دوچار تھا۔ یہ قانون فطرت ہے جس سے ہر انسان کا سابقہ پیش آتا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ان مراحل حیات کا تذکرہ آیا ہے(۱)

عمر بڑھنے کے ساتھ انسانی اعضاء کی ہیئتوں میں ہونے والی تبدیلیاں فطری ہیں۔ ان تبدیلیوں کو روکنے یا ان اعضاء کی ہیئتوں کو من پسند ہیئتوں میں بدلوانے کی کوشش کرنا فطرت سے بغاوت کے مترادف ہے۔ یہ اللہ کی خلقت میں تبدیلی ہے، جسے شیطانی تحریک کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر خواتین کا بڑھاپے کے نتیجے میں پستانوں میں پیدا ہونے والے ڈھیلے پن یا ہاتھوں اور چہرہ پر ظاہر ہونے والی جھریوں کو دور کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا اسلامی شریعت کی رو سے جائز نہ ہوگا۔ البتہ اگر کسی شدید بیماری کی وجہ سے جوانی میں یہ عوارض ظاہر ہو گئے ہوں اور دواؤں سے انھیں دور نہ کیا جا سکتا ہو، ان کے ازالہ کی واحد صورت پلاسٹک سرجری ہو تو اس صورت میں اس تکنیک سے فائدہ اٹھا کر ان عوارض کو دور کرنے کی اجازت ہوگی۔

۵۔ کم عمر یا خوب صورت نظر آنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا

انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ خوب صورت دکھائی دے اور اس کا ظاہر دوسرے انسانوں کی نگاہ میں بھلا معلوم دے۔ اس کے لیے وہ مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے۔ شریعت نے نہ صرف اس کا اعتبار کیا ہے بلکہ اس کو پسندیدہ قرار دیا ہے اور انسانوں کو زیب و زینت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

(۱) ملاحظہ کیجیے، النحل: ۷۰، الحج: ۵، الروم: ۵۴، یٰس: ۶۸، المومن: ۶۷

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

"اے بنی آدم، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔"

ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو غرور و تکبر کے برے انجام سے ڈراتے ہوئے فرمایا: "وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو" یہ سن کر ایک شخص نے دریافت کیا: آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو (کیا اس کا شمار بھی تکبر میں ہوگا؟) آپ ﷺ نے فرمایا:

إن الله جميل يحب الجمال الكبر بطر الحق وغمط الناس ⑴

"اللہ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے (ظاہری زیب و زینت اختیار کرنا تکبر نہیں ہے) تکبر یہ ہے کہ حق کو ٹھکرایا جائے اور دوسروں کو حقیر سمجھا جائے۔"

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جس کے بال پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: "کیا یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جس سے اپنے بالوں کو درست کرلے" اسی طرح آپ نے ایک شخص کو میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھا تو فرمایا "کیا اسے کوئی چیز نہیں ملتی جس سے اپنے کپڑے دھولے؟" ⑵

لیکن خوب صورتی اختیار کرنے کی تدابیر کو شریعت نے حدود کا پابند بنایا ہے۔ اس کے نزدیک حسن و جمال میں اضافہ کے لیے خارجی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں، لیکن جسم کے اعضاء یا ان کی ہیئتوں میں کوئی تبدیلی کرانا جائز نہیں ہے۔ احادیث میں ایسی کئی چیزوں سے صراحت کے ساتھ روکا گیا ہے جو صدرِ اسلام میں عربوں کے درمیان حسن و جمال میں اضافہ کے لیے رائج اور معروف تھیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

لعن رسول الله ﷺ الواصلات الموتشمات والمتنمصات والمتفلجات

⑴ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ، ۹۱

⑵ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی غسل الثوب وفی الخلقان، ۴۰۶۲

للحسن المغیّرات(۱)

”اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت کی ہے ان عورتوں پر جو (جسموں پر) گودتی ہیں اور گدواتی ہیں، اور بھوؤں کے بال اکھیڑتی ہیں اور خوب صورتی کے لیے دانتوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ عورتیں (اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں) تبدیلی کرنے والی ہیں۔“

محدثین نے صراحت کی ہے کہ یہ کام عرب میں عورتیں حسن میں اضافہ کے لیے انجام دیتی تھیں۔ ان کے ذریعے بڑی عمر کی عورتیں جوان عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ چند تصریحات ملاحظہ ہوں:

امام نوویؒ (۶۷۶ھ) نے لکھا ہے:

”فلج کے معنی ہیں ثنایا اور رباعیات یعنی دانتوں کے درمیان فاصلہ ہونا۔ متفلجات سے مراد وہ عورتیں ہیں جو ان دانتوں کو گھس کر ان کے درمیان فاصلہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ کام بوڑھی اور بڑی عمر کی عورتیں کرتی تھیں، تاکہ وہ کم عمر دکھائی دیں اور ان کے دانت خوب صورت لگیں۔ دانتوں کے درمیان معمولی فاصلہ فطری طور پر چھوٹی بچیوں میں ہوتا ہے۔ جب عورت بوڑھی ہو جاتی ہے، اس کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے اور اس کے دانتوں میں یہ فاصلہ باقی نہیں رہتا تو وہ انھیں ریتی سے گھستی ہے، تاکہ ان کے درمیان کچھ فاصلہ ہو جائے، وہ خوب صورت دکھائی دینے لگے اور دوسرے اسے دیکھ کر کم عمر سمجھیں“ (۲)

---

(۱) سنن نسائی، کتاب الزینۃ، باب المتفلجات، ۵۰۹۹، سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الواصلۃ والواشمۃ، ۱۹۸۹۔ علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ سنن نسائی میں کچھ اور روایتیں ہیں جن میں حضرت عبد اللہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سننے کی صراحت کی ہے (۵۱۰۷، ۵۱۰۸، ۵۱۰۹) علامہ البانی نے ان روایتوں کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت (۵۹۳۹) میں حضرت علقمہؓ سے مروی ہے کہ ”حضرت عبد اللہ نے لعنت کی ہے ......“ اور بعض دیگر روایتوں میں حضرت عبد اللہ فرماتے ہیں کہ ”اللہ نے لعنت کی ہے......“ (ملاحظہ کیجیے صحیح بخاری: ۴۸۸۶، ۵۹۳۱، ۵۹۳۹، ۵۹۴۳، ۵۹۴۸، صحیح مسلم: ۲۱۲۵، سنن ابی داؤد: ۴۱۶۹، جامع ترمذی: ۲۷۸۲، سنن دارمی: ۲۶۴۷، مسند احمد: ۱/ ۴۳۴، ۴۴۳، ۴۵۴

(۲) نووی، شرح صحیح مسلم: ۱۳/ ۱۰۶-۱۰۷

حافظ ابن حجرؒ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

> "متفلجات سے مراد وہ عورتیں ہیں جو ثنایا اور رباعیات نامی دانتوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرتی تھیں۔ عورت اس کو حسن کی علامت سمجھتی تھی۔ یہ کام وہ عورت کرتی تھی جس کے دانت ملے ہوئے ہوتے تھے، تاکہ ان کے درمیان کچھ فاصلہ ہو جائے۔ بسا اوقات ایسا بڑی عمر کی عورت کرتی تھی تاکہ دوسرے اسے دیکھ کر کم عمر سمجھیں، کیوں کہ کم عمر عورت کے دانت اکثر الگ الگ اور چمک دار ہوتے ہیں۔ بڑی ہونے پر اس کے دانتوں میں یہ خاصیت باقی نہیں رہتی۔"(۱)

مذکورہ بالا حدیث میں المتفلجات کے ساتھ للحسن بھی مذکور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ افعال اس صورت میں مذموم ہیں جب انھیں حسن میں اضافہ کے مقصد سے انجام دیا جائے، لیکن اگر ان کا سبب کوئی دوسرا ہو تو ان کی ممانعت نہ ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی تشریح مروی ہے۔ فرماتے ہیں:

> **لُعنت الواصلة والمستوصلة والنامصة والمتنمصة والواشمة والمستوشمة من غير داء**(۲)
>
> "بالوں میں بال جوڑنے والی، بھوں کے بال اکھیڑنے والی اور اکھڑوانے والی، جسم پر گودنے والی اور گودوانے والی پر لعنت کی گئی ہے، اس صورت میں جب یہ کام بغیر کسی مرض کے انجام دیے جائیں۔"

محدثین نے بھی صراحت کی ہے کہ یہ کام اسی صورت میں مذموم ہیں جب انھیں حسن میں اضافہ کے لیے انجام دیا جائے۔ علاج معالجہ کے مقصد سے ان کی انجام دہی میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے:

> "حدیث کے الفاظ ہیں: المتفلجات للحسن۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آرہی

---

(۱) فتح الباری: ۱۰/ ۳۷۲

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الترجل، باب صلۃ الشعر، ۴۱۷۰

> ہے کہ قابل مذمت وہ صورت ہے جب اس کام کو حسن میں اضافہ کے مقصد سے کرے لیکن اگر اسے اس کی ضرورت کسی اور مقصد سے، مثلاً علاج کے لیے پیش آئے تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے۔" (۱)

علامہ عینیؒ (م ۸۵۵ھ) فرماتے ہیں:

> "للحسن میں لام علت کا ہے۔ (یعنی مذمت اس صورت میں ہے جب اسے حسن میں اضافہ کے لیے کیا جائے۔) اس سے وہ صورت مستثنیٰ ہے جس میں وہ کام علاج معالجہ یا اس جیسی کسی اور ضرورت سے انجام دیا جائے۔" (۲)

شریعت میں یہ کام کیوں ممنوع قرار دیے گئے ہیں؟ علماء نے اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ قرطبیؒ (م ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

> "سبب نہی کے سلسلے میں متعدد اقوال ہیں: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے اس وجہ سے روکا گیا ہے کیوں کہ یہ دھوکہ (تدلیس) کے قبیل سے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تبدیلی ہے۔ یہ قول حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔ یہ زیادہ صحیح ہے۔ اس میں اول الذکر قول بھی شامل ہے۔" (۳)

امام نوویؒ نے لکھا ہے:

> "مذکورہ احادیث میں اس فعل کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تبدیلی ہے، 'تدلیس' (دھوکہ) ہے اور 'تزویر' (فریب) ہے۔" (۴)

مذکورہ بالا حدیث میں المتنمصات (بھوؤں کے بال اکھیڑنے والی عورتوں) پر بھی لعنت کی گئی ہے۔ یہ ممانعت بھی اسی صورت میں ہے جب یہ کام محض فیشن اور اضافۂ حسن کے مقصد سے کیا جائے۔ لیکن اگر عورت کے چہرے پر غیر ضروری بال اگ آئیں تو وہ انھیں زینت

---

(۱) فتح الباری: ۱۰/ ۳۷۲-۳۷۳

(۲) بدر الدین عینی، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری: ۸/ ۹۵

(۳) قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۵/ ۵۹۳

(۴) شرح مسلم نووی: ۱۴/ ۱۰۷

اختیار کرنے کے مقصد سے اکھیڑ سکتی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا: اے ام المومنین! میرے چہرے پر کچھ بال اگ آئے ہیں۔ کیا میں اپنے شوہر کے لیے زینت اختیار کرنے کے مقصد سے انھیں اکھیڑ سکتی ہوں؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''اس تکلیف دہ چیز کو اپنے جسم سے الگ کردو۔''(۱)

فقہائے کرام نے بھی صراحت کی ہے کہ اگر عورت کے چہرے پر غیر طبعی طور سے بال اگ آئیں تو وہ انھیں بلا کراہت صاف کر سکتی ہے۔

علامہ ابن عابدین حنفیؒ (م ۱۲۵۲ھ) فرماتے ہیں:

> ''بال اکھیڑنے کی ممانعت اس پر محمول ہے کہ عورت اس کام کو غیروں کے لیے زینت اختیار کرنے کے مقصد سے انجام دے، ورنہ اگر اس کے چہرے پر کچھ بال ہوں، جن سے اس کے شوہر کو نفرت ہوتا ہو تو ان کے ازالہ کو ممنوع قرار دینا صحیح نہیں۔ اس لیے کہ عورتوں کا زینت اختیار کرنا مطلوب ہے...... چہرے کے بالوں کو صاف کرنا حرام ہے، لیکن اگر عورت کے چہرے پر داڑھی یا مونچھ اگ آئے تو اسے صاف کرانا ممنوع نہیں، بلکہ مستحب ہے۔''(۲)

مالکیہ نے بھی صراحت کی ہے کہ جن (غیر ضروری) بالوں کو صاف کرنے میں عورت کا حسن ہو انھیں صاف کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر عورت کو داڑھی اگ آئے تو وہ اسے صاف کرے گی اور جن بالوں کو باقی رکھنے میں اس کا حسن ہے انھیں باقی رکھے گی۔ شوافع کہتے ہیں کہ اگر شوہر عورت کو جسم کے غیر ضروری بال صاف کرنے کا حکم دے تو اس کے لیے ایسا کرنا واجب ہے۔(۳)

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ (م ۶۲۰ھ) نے لکھا ہے: ''امام ابو عبداللہ (احمد بن حنبلؒ) سے چہرے کے بال صاف کرانے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: عورتوں کے لیے

---

(۱) عبدالرزاق، المصنف: ۳/ ۱۴۶

(۲) ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۵/ ۳۲۸

(۳) الفواکہ الدوانی، ۲/ ۳۰۱، حاشیۃ الطحطاوی، ۳/ ۲۵۲ بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیہ، ۲۴/ ۲۷۳_۲۷۴

ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ مردوں کے لیے مکروہ ہے۔" (۱)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کم عمر لگنے یا حسن و جمال میں اضافہ کے مقصد سے پلاسٹک سرجری کرانا اسلامی شریعت کے نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے۔ حسن و جمال کا ایک اوسط معیار ہے۔ کوئی عورت اس معیار سے اپنے آپ کو فروتر پائے اور اس کی بدصورتی و بدہیئتی نمایاں ہو تو وہ اوسط معیار تک پہنچنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرا سکتی ہے۔ لیکن حسن و جمال کے اعلیٰ اور اپنے پسندیدہ معیار تک پہنچنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا شریعت کی نگاہ میں مطلوب و مستحب نہیں ہے۔

۶۔ شناخت چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا:

بسا اوقات انسان کو کسی وجہ سے حکم رانوں کے مظالم کا شکار ہونے کا شدید اندیشہ رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان کی گرفت میں نہ آئے، ورنہ وہ اسے ناقابلِ برداشت اذیتوں سے دوچار کریں گے۔ کیا ایسی صورت میں اسے اپنی شناخت چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانے کی اجازت ہوگی؟ اسلامی شریعت کی مجموعی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جھوٹ، مکر و فریب اور دھوکہ دہی کو ناپسندیدہ کاموں میں شمار کیا گیا ہے اور ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اسلام کا عمومی مزاج یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ کوئی بھی فرد اسی طرح دکھائی دے جس طرح وہ حقیقت میں ہے۔ بہروپ بنانا اور سوانگ بھرنا اس کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ ایک عورت نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میری ایک سوکن ہے۔ کیا میرے اوپر گناہ ہوگا اگر میں اس کے سامنے یہ اظہار کروں کہ میرے شوہر نے مجھے فلاں فلاں چیزیں دی ہیں، حالاں کہ حقیقت میں اس نے وہ چیزیں نہ دی ہوں؟ آپ نے فرمایا:

> "المتشبع بما لم یعط کلابس ثوبی زور" (۲)
>
> "جسے کوئی چیز حاصل نہ ہو اور وہ اس کے حاصل ہونے کا اظہار کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جو جھوٹ و فریب کے کپڑے پہنے ہوئے ہو۔"

---

(۱) ابن قدامہ، المغنی: ۱/۹۱

(۲) صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب المتشبع بما لم ینل، ۵۲۱۹، صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب النھی عن التزویر فی اللباس، ۲۱۳۰

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی حق پر ثابت قدم رہے اور اس راہ میں جو کچھ آلام و مصائب آئیں انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ اس پر وہ بارگاہِ الٰہی میں اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ شریعت نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر تکالیف اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوں تو وہ خلافِ حقیقت بات زبان پر لا سکتا ہے۔ (آل عمران: ۲۸، النحل: ۱۰۶) شریعت اس کی بھی اجازت دیتی ہے کہ ظلم و تعدی سے بچنے کے لیے وہ راہِ فرار اختیار کر سکتا اور کہیں چھپ سکتا ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابوبصیرؓ اور مکہ میں رہنے والے دیگر متعدد مسلمانوں نے اہلِ مکہ کی گرفت سے بچنے کے لیے ایک مقام پر پناہ لے لی تھی(۱) لیکن شناخت چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کروانے میں متعدد اسبابِ نہی جمع ہیں۔ اس میں تزویر (فریب) و تدلیس (دھوکہ) کے ساتھ اللہ کی خلقت میں تبدیلی بھی ہے، اس لیے اسے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔

خلاصۂ بحث

گزشتہ صفحات میں کی گئی پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ پلاسٹک سرجری کی وہ تمام صورتیں جائز ہیں جو علاج معالجہ کے قبیل سے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر صورتیں (مثلاً کم عمر دکھائی دینے، حسن و جمال میں اضافہ کرنے یا شناخت چھپانے کے مقصد سے پلاسٹک سرجری کرانا) جائز نہیں ہیں۔

☆☆☆

---

(۱) ابن ہشام، سیرۃ النبی ﷺ: ۲/ ۳۲۲-۳۲۳

عام تباہی کے اسلحہ کا استعمال

جنگیں زمانہ قدیم میں بھی ہوتی رہی ہیں، لیکن ان میں روایتی ہتھیاروں کا استعمال کیا جاتا تھا، اس وجہ سے ہلاکتیں اور تباہی و بربادی محدود پیمانے پر ہوتی تھی۔ بیسویں صدی میں ایک نئی صورت حال سامنے آئی کہ ایسے ہتھیار استعمال کیے جانے لگے جو بڑے پیمانے پر تباہی مچانے والے تھے اور جن سے بہت بڑی تعداد میں انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) میں کیمیاوی اسلحہ کا استعمال کیا گیا، پھر جنگ عظیم دوم کے دوران میں نیوکلیائی اسلحہ کا تجربہ کیا گیا۔ امریکا نے اگست ۱۹۴۵ء میں جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے، جس کے نتیجے میں ہیروشیما میں نوے ہزار سے ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار کے درمیان اور ناگاساکی میں ساٹھ ہزار سے اسی ہزار کے درمیان انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ ان میں سے نصف تعداد بم گرائے جانے کے پہلے ہی دن ہلاک ہو گئی تھی۔

ایسے ہتھیار، جن سے بڑے پیمانے پر تباہی مچتی ہے، ان کے لیے ایک نئی اصطلاح وضع کی گئی۔ وہ ہے: WEAPONS OF MASS DESTRUCTION (WMD) تاریخی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں Canterbury کے ایک آرک بشپ نے کیا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یہ ایک مقبول اصطلاح بن گئی۔ اس سے مراد وہ اسلحہ ہیں جو انسانوں اور دیگر جان داروں کی بڑی تعداد کو ہلاک کر دیں، یا شدید نقصان پہنچائیں اور انسانی تعمیرات اور قدرتی اسٹرکچرس کو تباہ و برباد کر دیں۔ ان میں تین طرح کے اسلحے شامل ہیں: جوہری (NUCLEAR) کیمیاوی (CHEMICAL) اور حیاتیاتی

(BIOLOGICAL)۔ ان اسلحہ کی تباہ کاری کو دیکھتے ہوئے عالمی سطح پر عام بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، بین الاقوامی تنظیموں کے ذریعے ان کی تیاری اور استعمال پر پابندی عائد کرنے کے معاہدے مرتب کیے گئے اور سب ہی ممالک پر زور دیا گیا کہ وہ ان پر دستخط کریں۔ ان معاہدوں میں سے چند یہ ہیں:

- Partial Test Ban treaty (PTBT)
- Outer Space Treaty (OST)
- Nuclear Non-Proliferation Treaty (NPT)
- Comprehensive Test Ban Treaty (CTBT)

میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی سطح پر بھی اس موضوع کا خوب چرچا ہوا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۰۰۲ء میں امریکا میں ہوئے ایک سروے کے مطابق WEAPONS OF MASS DESTRUCTION سب سے زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ تھے۔

مسئلے کا سیاسی پہلو

اس مسئلے کا ایک پہلو سیاسی ہے۔ دنیا کے آٹھ ممالک نیوکلیائی اسلحہ رکھتے ہیں: امریکا، فرانس، برطانیہ، چین، شمالی کوریا، روس، ہندوستان اور پاکستان۔ عسکری تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اسرائیل کے پاس بھی نیوکلیائی اسلحے ہیں، لیکن وہ کھلے الفاظ میں اس کا اقرار کرتا ہے نہ انکار۔ اب اس بات کی کوشش ہورہی ہے اور امریکہ اس میں پیش پیش ہے کہ مزید کوئی ملک نیوکلیائی صلاحیت نہ حاصل کرنے پائے۔ گزشتہ صدی میں نوے کی دہائی میں عراق پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ عام تباہی کے اسلحہ رکھتا ہے، پورا ملک کھنگال ڈالا گیا، مگر یہ اسلحہ نہیں ملے۔ اسی الزام کے تحت ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملہ کرکے اسے تہس نہس کردیا گیا۔ اب یہی الزام ایران کے سلسلے میں بھی دوہرایا جارہا ہے۔ ایران صاف الفاظ میں اس سے انکار کرتا ہے، مگر کوتوال ہے کہ مان کر نہیں دے رہا ہے۔ القاعدہ کے بارے میں وقتاً فوقتاً یہ شوشہ چھوڑا جاتا ہے کہ وہ نیوکلیائی اسلحہ کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ غرض یہ اصطلاح WEAPONS OF MASS

DESTRUCTION اس حیثیت سے بھی کافی مقبول ہوگئی ہے کہ جس پر چاہے اس کا الزام لگا دیا جائے اور اس کے بہانے اس پر جو پابندیاں چاہیں، عائد کردی جائیں۔ ۲۰۰۳ء میں امریکا میں Lake Superior State University نے اصطلاحات کی ایک فہرست شائع کی اور بتایا کہ ان میں سب سے زیادہ misuse اور overuse اسی اصطلاح کا ہوا ہے۔

اس وقت اس مسئلے کے سیاسی پہلو پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے۔ یہاں صرف علمی حیثیت سے اس پر بحث کرنا اور اسلامی نقطہ نظر واضح کرنا مقصود ہے۔

اسلام کی چند اصولی تعلیمات

زیر بحث موضوع پر آنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی چند اصولی تعلیمات بیان کردی جائیں، جن کا اس موضوع سے گہرا تعلق ہے:

(۱) اسلام جنگ کے مقابلے میں امن کو اولیت دیتا ہے، لیکن جب جنگ ناگزیر ہوجائے تو اس سے پہلوتہی بھی نہیں کرتا۔ جنگ کے دوران میں وہ مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان فرق کرتا ہے۔ مقاتلین سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں عملاً حصہ لیتے ہیں، یا حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں، یعنی جوان مرد اور غیر مقاتلین سے وہ لوگ مراد ہیں جو عموماً جنگ میں حصہ نہیں لیتے، جیسے عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، خانقاہ نشیں، معبدوں کے پجاری وغیرہ۔ جنگ کے دوران میں اسلام مقاتلین کو قتل کرنے کی اجازت دیتا ہے، جب کہ غیر مقاتلین کو قتل کرنے سے روکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے میدان جنگ میں ایک عورت کی لاش دیکھی تو عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔(۱) ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس موقع پر آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ”یہ تو لڑنے والوں میں شامل نہ تھی“۔ پھر فوج کے سپہ سالار حضرت خالد بن الولیدؓ کو بلا کر سختی سے تاکید کی:

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب قتل الصبیان فی الحرب، باب قتل النساء فی الحرب، ۳۰۱۴، ۳۰۱۵، صحیح مسلم، کتاب الجہاد، ۱۷۴۴

لا تقتلن ذریۃ ولا عسیفا۔(۱)

"عورت، بچے اور مزدور کو ہرگز قتل نہ کرے۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لا تقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا صغیرا ولا امرأۃ۔(۲)

"نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرو، نہ چھوٹے بچے کو، نہ عورت کو۔"

حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ جب کہیں فوج بھیجتے تھے تو یہ ہدایت کرتے تھے:

لا تقتلوا الولدان ولا أصحاب الصوامع۔(۳)

"بچوں اور خانقاہ نشینوں کو قتل نہ کرو۔"

(۲) اسلام امن کا علم بردار ہے۔ وہ کسی کے خلاف جارحیت کو پسند نہیں کرتا، لیکن اگر کوئی جارحیت کا مظاہرہ کرے تو اسے برداشت کرنے کی بھی تعلیم نہیں دیتا۔ مشرکین مکہ نے مسلمانوں کے خلاف جنگ برپا کی تو مسلمانوں کو ان کا جواب دینے اور ان سے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ (البقرۃ: ۱۹۰)

"لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۚ
(الحج: ۳۹-۴۰)

---

(۱) سنن ابن ماجہ، ابواب الجہاد، باب الغارۃ والبیات وقتل النساء والصبیان، ۲۸۴۲

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین ۲۶۱۳ صححہ الالبانی

(۳) مسند احمد: ۱/ ۳۰۰

> ”اجازت دے دی گئی (جنگ کی) ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ”ہمارا رب اللہ ہے“۔
>
> فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠
>
> (البقرۃ: ۱۹۴)
>
> ”لہٰذا جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے“

(۳) اسلام اپنی ریاست کو مضبوط اور مستحکم دیکھنا چاہتا ہے۔ اتنی مستحکم کہ اس کے دشمن اسے نرم چارہ نہ سمجھیں اور اس کی طرف غلط نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ اسی لیے وہ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ
>
> (الانفال: ۶۰)
>
> ”اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو، تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے، مگر اللہ جانتا ہے۔“

اس آیت میں دو الفاظ قابلِ غور ہیں: ایک ’قوۃ‘، جو نکرہ ہے اور نکرہ میں عموم پایا جاتا ہے، اس میں ہر طرح کی عسکری قوت شامل ہے۔ بہ طور مثال آیت میں گھوڑوں کا تذکرہ ہے، جو زمانۂ نزولِ قرآن میں عسکری طاقت کا ایک مظہر تھے اور حدیث میں اس کی تعبیر ’تیر اندازی‘ سے کی گئی ہے (الا ان القوۃ الرمی)[1] دوسرا لفظ ’ترھبون‘ ہے۔ اس کے ذریعے عسکری طاقت کے حصول کا مقصد بیان کر دیا گیا، یعنی دشمن کو خوف زدہ کرنا۔ مفسر ابو حیان نے اس آیت کی تفسیر

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی والحث علیہ، ۱۹۱۷

میں لکھا ہے:

> ”اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کفار کو معلوم ہوگا کہ تم نے جنگ کے لیے کتنی تیاری کر رکھی ہے، کتنی قوت جمع کر رکھی ہے اور کتنے گھوڑے مہیا کر رکھے ہیں تو وہ اپنے پڑوسی کافروں کو تمھاری جنگی تیاریوں کے بارے میں بتا کر خوف زدہ کر دیں گے اور جب وہ تمھارے سلسلے میں اپنے پڑوسیوں کو خوف زدہ کر دیں گے تو وہ خود تم سے اور زیادہ خوف زدہ رہیں گے۔“(۱)

اس آیت سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ عسکری تیاری کرنا اور اس کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنا اور اسلحہ فراہم کرنا جنگ بھڑکانے کے لیے نہیں ہے، بلکہ دشمن کو دست درازی سے روکنے کی ایک تدبیر ہے۔ اس کی ضرورت ہر زمانے میں محسوس کی گئی ہے اور آج بھی یہ تسلیم شدہ ہے۔ یہ انسانی قدروں اور اخلاقی اصولوں کے منافی نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس ان کی پاس داری کی ایک موثر تدبیر ہے۔ یہ جنگ کا ماحول پیدا کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ جنگ نہ ہونے اور امن قائم رہنے کی ایک تدبیر کے طور پر ہے۔ علامہ رشید رضا نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

> ”یہاں بہ قدر استطاعت قوت اور گھوڑوں کی فراہمی کو اس سے خاص کر دیا گیا ہے کہ اس کا مقصد ان لوگوں کو خوف زدہ کرنا ہو جو علانیہ دشمن ہیں اور جو چھپے ہوئے اور گم نام دشمن ہیں اور جو آئندہ اہل ایمان کے دشمن بن کر سامنے آئیں گے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ’ارہاب‘ اس کے نزدیک جنگ کو روکنے کے لیے ہے، نہ کہ جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے۔ وہ کہتا ہے کہ تیار رہو، تاکہ دشمن تم سے خوف زدہ رہے، ممکن ہے اس طرح وہ تم پر حملہ کرنے سے باز رہے۔ یہ بعینہ وہی بات ہے جو آج کے ملکوں میں ’مسلح امن‘ کے نام سے جانی جاتی ہے، جس کی بنیاد یہ ہے کہ ضعف درحقیقت طاقت ور کو کم زور پر دست درازی کی ترغیب دیتا ہے۔“(۲)

---

(۱) ابو حیان الاندلسی، البحر المحیط: ۵۰۸/۴

(۲) محمد رشید رضا، تفسیر المنار: ۷۵/۱۰

نئی صورت حال

عام تباہی کے اسلحہ کی ایجاد سے دنیا ایک نئی صورت حال سے دوچار ہو گئی ہے۔ ایک طرف ان کی خطرناکی اور ان کی وجہ سے بڑے پیمانے پر ہونے والی تباہی، انسانی جانوں کا ضیاع اور املاک کی بربادی ہے، جس کا دنیا تجربہ بھی کر چکی ہے، دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اسلحہ کو موجودہ دور میں طاقت و قوت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ جو ممالک ایٹمی طاقت بن چکے ہیں انھیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انھوں نے جو ایٹمی اسلحے تیار کر رکھے ہیں ان سے وہ دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن چاہتے ہیں اور اس کے لیے کوشاں بھی ہیں کہ کوئی دوسرا ملک وہ صلاحیت حاصل نہ کرنے پائے۔

اسلام کا نقطۂ نظر

عام تباہی مچانے والے اسلحہ کی تیاری اور ان کے استعمال کا مسئلہ مسلم امت کے درمیان زیادہ بحث و گفتگو کا موضوع نہیں بنا ہے۔ زیادہ تر علماء، مفکرین اور دانش وروں نے اس پر خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ جن لوگوں نے اس پر کچھ لکھا ہے ان کی تحریریں بہت مختصر ہیں اور ان سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

اس مسئلے پر علماء اور دانش وروں کے دو الگ الگ موقف پائے جاتے ہیں۔ کچھ حضرات ہیں جو موجودہ حالات میں عام تباہی کے اسلحہ کی تیاری کو جائز اور مسلم ممالک کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں، تو کچھ دوسرے حضرات اس کے عدم جواز کی رائے دیتے ہیں۔ ذیل میں دونوں نقطہ ہائے نظر کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

جواز کے قائلین

موجودہ دور کے جن علماء کو اپنے علمی کام کی وجہ سے عالمی سطح پر اعتبار و استناد حاصل ہوا ہے، ان میں سے ایک ڈاکٹر وھبہ الزحیلی ہیں (ولادت ۱۹۳۲ء)۔ دمشق یونی ورسٹی میں فقہ کے

استاد ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے اپنی دو تصانیف میں اظہار خیال کیا ہے۔ ایک آثار الحرب فی الفقه الاسلامی: دراسة مقارنة اور دوسری العلاقات الدولية فی الاسلام مقارنة بالقانون الدولی الحديث ہے۔ اپنی اول الذکر کتاب میں انھوں نے لکھا ہے:

> "دو حالتیں ایسی ہیں جن میں ناگزیر طور پر غیر مقاتلین کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ ناگزیر حالات میں ممنوعات بھی جائز ہوجاتی ہیں (الضرورات تبيح المحظورات)۔ یہ دو حالتیں درج ذیل ہیں:
>
> اول: حملۂ عام کی حالت (حالة الغارات)، اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل طائف کے خلاف منجنیق کا استعمال کیا تھا، حالاں کہ آپ جانتے تھے کہ ان میں عورتیں، بچے، بوڑھے اور دیگر معذورین بھی ہیں۔ یہ ناگزیر صورت حال ہے اور ایسے ناگزیر حالات میں وہ چیزیں جائز ہوجاتی ہیں جو عام حالات میں ممنوع ہوتی ہیں۔ یہ چیز جنگی قانون میں جائز ہے۔ زمینی جنگ کے قوانین اس رائے کی تائید کرتے ہیں جس پر عمل ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ کسی جگہ کا محاصرہ کرنے والی فوج کے لیے جائز ہے کہ وہ وہاں کی صرف تنصیبات پر حملہ نہ کرے، بلکہ رہائشی علاقوں کو بھی نشانہ بنائے، اس لیے کہ املاک کے نقصان، عمارتوں کے انہدام اور آبادی کی ہلاکت سے مدافعت کرنے والی فوج پر دباؤ پڑتا ہے اور وہ خود سپردگی پر آمادہ ہوجاتی ہے۔
>
> دوم: غیر مقاتلین کو ڈھال بنالینے کی حالت (حالة التترس)۔ فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر مشرکین کچھ مسلمانوں کو ڈھال بنالیں تو ان کی پروا کیے بغیر دشمنوں پر حملہ جاری رکھنا جائز ہے۔ اس میں 'مصالح مرسلہ' کا اصول کارفرما ہے۔ اسے ان لوگوں نے بھی جائز قرار دیا ہے، جو اس اصول کو اختیار کرنے میں بہت محتاط ہیں، مثلاً امام غزالی۔ انھوں نے شرط عائد کی ہے کہ مصلحت ناگزیر، قطعی اور کلی ہو تبھی اس کا اعتبار کیا جائے گا، جیسے تترس یعنی غیر مقاتلین کو ڈھال بنالینے کی حالت۔ اس حالت میں ان کی پروا نہیں کی جائے گی، تاکہ دشمن کو کامیاب ہونے کا موقع نہ مل سکے۔"(۱)

---

(۱) ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، ص ۵۰۶ ـ ۵۰۷

مولانا سید جلال الدین عمری نے جنگ کے اسلامی آداب سے بحث کرتے ہوئے ابن قدامہ حنبلی کے حوالے سے فقہاء کا متفقہ نظریہ بیان کیا ہے کہ ”عورت، شیخ فانی، اپاہج، اندھے اور راہب پر میدانِ جنگ میں ہاتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ ہاں اگر وہ جنگ میں براہِ راست حصہ لیں یا معاونت کریں تو مارے جا سکتے ہیں۔ اگر دشمن ان کمزور طبقات کو ڈھال بنا کر حتیٰ کہ مسلمانوں کو آگے کر کے کوئی جنگی چال چلنا چاہے تو اس کا جواب ضرور دیا جائے گا۔ اسی طرح عورتیں اور بچے وغیرہ کسی عمومی حملے کی زد میں آجائیں تو یہ جنگی مجبوری ہوگی۔“(۱)

عورت کے بارے میں ہدایہ کے حوالے سے کہا ہے کہ ”عورت باقاعدہ جنگ میں شریک نہ ہو، لیکن وہ قیادت کر رہی ہو یا حملہ آور ہو تو اس کا جواب دیا جائے گا“(۲)

ایک دوسرے عالم دین شیخ محمد الغزالیؒ (م ۱۹۹۶ء) ہیں۔ ان کا تعلق مصر سے ہے۔ الاخوان المسلمون کے رہنماؤں میں سے تھے، بعد میں بعض وجوہ سے اس سے تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۱۹۹۵ء میں جب نیوکلیائی اسلحہ کے عدمِ استعمال کے معاہدے Nuclear Non-Proliferation Treaty (NPT) پر دستخط کرنے کے لیے مختلف ممالک پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا، شیخ محمد الغزالیؒ نے یہ بیان جاری کیا:

> ”مصری حکومت کسی ایسے معاہدے پر کیسے دستخط کر سکتی ہے، جس میں ایسے اسلحہ پر پابندی لگائی گئی ہو جو اس کے پاس موجود ہی نہ ہوں۔ ایسے اسلحے اسرائیل کے پاس ہیں، اس لیے اسے اس معاہدہ پر دستخط کرنا چاہیے اور اگر وہ دستخط نہ کرے تو بین الاقوامی سطح پر اس کا بائیکاٹ کیا جانا چاہیے۔ مسلم ممالک کو چاہیے کہ وہ نیوکلیائی صلاحیت حاصل کرنے اور اسے ترقی دینے کی کوشش کریں، تا کہ وہ اسرائیل پر سبقت لے جائیں، کیوں کہ اسرائیلی اسلحے مسلم ممالک کے لیے کھلا خطرہ ہیں۔“(۳)

---

(۱) مولانا سید جلال الدین عمری، غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، ص ۲۱۱-۲۱۵

(۲) حوالہ سابق، ص ۲۱۳

(3) SOHAIL H. HASHMI (Editor), Ethics and weapons of Mass Destructing: Religious and Secular Perspectives, West Nyack NY. USA, Cambridge University Press, 2004, P 345

تیسرے دانش ور، جنھوں نے نیوکلیائی اسلحوں کی تیاری کے جواز کی بات کہی ہے، پروفیسر خورشید احمد ہیں۔ موصوف جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر اور پاکستان کی قومی اسمبلی (سینیٹ) کے رکن ہیں۔ ایک علمی ادارہ Institute of Policy studies اسلام آباد کے چیرمین اور جماعت اسلامی پاکستان کے ترجمان ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کے مدیر ہیں۔ موصوف نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ہے: Capping the Nation: Pakistan's Security and the Nuclear Option۔ یہ اصلاً اس موضوع پر منعقدہ ایک سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔

۱۹۹۸ء میں ہندوستان اور پاکستان کے ایٹمی تجربات کے کچھ عرصے کے بعد پروفیسر خورشید احمد نے ترجمان القرآن میں ایک اداریہ لکھا تھا۔ اس کے کچھ منتخب حصے ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں:

> "ہم جوہری صلاحیت کے ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ الحمد للہ ہم نے بنیادی صلاحیت حاصل بھی کرلی ہے اور اس کا کامیاب مظاہرہ بھی کردیا ہے جس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور ان تمام افراد اور اداروں کی خدمات کے معترف ہیں جنھوں نے اس کارنامے کو انجام دینے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن ہمیں اس ناقابل تردید تاریخی حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے کہ جہاں اسلحہ کی دوڑ ایک خسارے کا سودا ہے اور محض تفاخر کی خاطر اس خطرناک کھیل میں ہرگز شریک نہیں ہونا چاہیے وہیں مقابلے کی قوت اور کم سے کم ضروری سد جارحیت (Minimum Credible Deterrent) قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔ قوت اور سد جارحیت کوئی جامد (Static) تصور نہیں، بلکہ حرکی (Dynamic) تصور ہے، جس کے لیے مدمقابل کی صلاحیت۔ حملہ کرنے کی اور حملہ سہنے کی۔ کو سامنے رکھ کر ضروری حدود کا تعین کیا جاتا ہے۔"(۱)

---

(۱) ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، دسمبر ۱۹۹۸ء، اشارات بعنوان 'ایٹمی صلاحیت اور قرضوں کا بوجھ' ص ۸۔۹

آگے مزید لکھتے ہیں:

> "مغربی اقوام نے جدید ٹکنالوجی پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ ضروری ہے کہ ہمیں نئی اور جدید ٹکنالوجی دینے اور ٹکنالوجی منتقل کرنے کی تمام منتقل تسلیوں کے باوجود جو راہیں ہم پر بند کر دی گئی ہیں، بشمول ہمارے سائنس دانوں اور اعلیٰ درجے کے طالب علموں کے لیے مغربی درس گاہوں اور لیبارٹریوں کے دروازوں کو بند کرنے کے، وہ کھولیں۔ اس کے بغیر ٹیکنالوجیکل امتیاز (Apartheid) کا جو ظالمانہ اور استبدادی نظام قائم کیا گیا ہے وہ انسانیت کو مستقل طور پر دو طبقوں میں بانٹ رکھے گا۔ سائنسی قوت سے آراستہ، بالادست اور غالب اقوام اور سائنسی صلاحیت سے محروم ان کے باج گزار ممالک۔ کیا پاکستان اور امت مسلمہ اس ذلت کے مقام کو قبول کرنے کو تیار ہے؟ اور کیا یہ ہمارے ایمان، خیر امت اور شہداء علی الناس کے مقام سے کوئی بھی مناسبت رکھتا ہے؟"(۱)

ان آراء کے حاملین نے اگرچہ اپنی تائید میں بعض نصوص پیش کی ہیں، لیکن ان پر مقامی حالات کا دباؤ صاف محسوس ہوتا ہے۔

عدمِ جواز کے قائلین

جو مسلم دانش ور عام تباہی مچانے والے اسلحہ کی تیاری اور استعمال کے عدم جواز کی رائے رکھتے ہیں، ان میں سے دو حضرات کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر سہیل ہاشمی ہیں۔ ان کی کتاب Ethics and Weapons of Mass Destruction: Religious and Secular Perspective ۲۰۰۳ء میں نیو یارک سے شائع ہوئی ہے۔ ۳۳۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اصلاً مختلف اصحاب فکر کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں WMD کے بارے میں مختلف مذاہب کا نقطۂ نظر بھی پیش کیا گیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی

---

(۱) ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، حوالہ سابق، ص ۱۰-۱۱

خود مرتب کتاب نے اپنے مضمون Islamic Ethics and Weapons of Mass Destruction:An Argument For Non-proliferation میں کی ہے۔

انھوں نے WMD کے بارے میں مسلم امت میں تین طرح کے نقطہ ہائے نظر رکھنے والوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک طبقہ جواز کے قائلین کا ہے۔ اسے وہ WMD Jihadists کا نام دیتے ہیں۔ دوسرا طبقہ Muslim WMD Terrorists کا قرار دیتے ہیں اور القاعدہ اور اس کے سربراہ اسامہ بن لادن کو ان کا نمائندہ بتاتے ہیں۔ تیسرا طبقہ عدم جواز کے قائلین کا ہے، جنھیں وہ Muslim WMD Pacifists کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی رائے موخر الذکر طبقہ کے حق میں دی ہے۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

> ”مسلمانوں کو WMD کے حصول اور اس کے امکانی استعمال کو درج ذیل اسباب سے رد کر دینا چاہیے:
>
> ۱۔ نیوکلیائی، کیمیاوی اور حیاتیاتی اسلحے مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔
>
> ۲۔ اگر ان کا استعمال صرف فوجی تنصیبات پر ہی کیا جائے تو بھی ہلاکتیں اتنے بھیانک طریقے سے ہوتی ہیں کہ وہ مقاتلین کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے ٹکراتی ہیں۔
>
> ۳۔ ان سے طبعی ماحولیات پر برا اثر پڑتا ہے اور دیگر مخلوقات بھی ہلاک ہوتی ہیں۔ قرآنی اصطلاح میں یہ 'فساد فی الارض' ہے۔
>
> ۴۔ ان کا استعمال ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتا، جن کا اخلاقی جواز موجود ہو۔ اس لیے ان کی تیاری پر آنے والے مصارف 'اسراف' کے دائرے میں آتے ہیں، جن سے قرآن و حدیث میں روکا گیا ہے۔“(۱)

اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے انھوں نے آخر میں لکھا ہے:

”اگر مسلمان اسلامی اخلاقیات پر عمل کریں تو میرا خیال ہے کہ وہ WMD کے کسی

---

(1) Ethics and weapon of Mass Destruction, P.323-324

> واستعمال کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اگر WMD جنگ میں استعمال کے لیے نہ ہوں تو محض مزاحمت و مدافعت (یا قومی وقار) کے لیے، اخلاقی، اقتصادی اور عسکری کسی اعتبار سے ان کی تیاری کا جواز نہیں بنتا۔"(۱)

ایک دوسرے دانش ور ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی ہیں، جو اپنی تصنیفات اور علمی کاموں کی وجہ سے عالم اسلام کی معروف شخصیت ہیں۔ ان کی ایک تصنیف 'مقاصد شریعت' کے عنوان سے ہے۔ اس کی بعض آراء سے اہل علم نے اختلاف کیا ہے، اس سے قطع نظر اس کتاب میں انھوں نے زیر بحث موضوع پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مقاصد شریعت کی روایتی فہرست میں کچھ اور موضوعات کا اضافہ کیا جائے، جو موجودہ دور میں بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں، ان میں سے ایک عام تباہی مچانے والے اسلحہ کا مسئلہ بھی ہے۔ اپنی بحث کے آغاز میں انھوں نے لکھا ہے:

> "اس بارہ میں دو رائے نہیں ہونی چاہیے کہ عام تباہی مچانے والے ہتھیار، جو محارب اور غیر محارب میں تمیز نہ کر سکتے ہیں، نہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں کو مستثنیٰ رکھ سکتے ہوں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جن سے تباہ کن اثرات موجودہ نسل کے بعد بھی کئی نسلوں تک اور جس علاقہ میں ان کو استعمال کیا جائے اس سے دور دراز تک کے علاقوں تک پھیل جاتے ہیں۔ ایسے ہتھیاروں کا استعمال فساد فی الارض میں داخل ہے۔ فساد فی الارض کو دور کرنا مقاصد شریعت میں سے ہے۔ چنانچہ نیوکلیائی، کیمیاوی اور حیاتیاتی اسلحوں کے بنانے پر اور ان کی خرید و فروخت نیز ان کے استعمال پر پابندی ہونی چاہیے۔ شریعت کی اصطلاح میں ان اسلحہ کو بنانا، ان کی خرید و فروخت اور ان کا استعمال حرام قرار پایا جانا چاہیے اور یہ حرمت غیر مشروط ہونی چاہیے۔ کوئی ایسی صورت متصور نہیں جس میں فساد فی الارض جائز ہو۔"(۲)

ڈاکٹر صاحب عام تباہی مچانے والے اسلحہ کے خلاف اس وجہ سے بھی ہیں کہ ان کے

---

(۱) حوالہ سابق، ص ۳۴۶

(۲) پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعت، ص ۲۹۳ ۲۹۴

بنانے، محفوظ رکھنے اور استعمال کرنے کے لیے خود کو ہر آن مستعد رکھنے پر کثیر مادی وسائل کے علاوہ ملک کی بہترین افرادی طاقت، اعلیٰ ترین علمی صلاحیتوں اور سب سے زیادہ وفادار، قابلِ بھروسہ اسٹاف کی خدمات درکار ہوتی ہیں۔ ان کی دیکھ ریکھ میں اتفاقی فروگزاشت اور اس کے نتیجے میں حادثوں کا بھی امکان موجود ہے اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اگر اس کام کو اولیت دی جائے تو دیگر مشترک انسانی مسائل کے حل کے لیے نہ مادی وسائل بچیں گے نہ افرادی طاقت اور اعلیٰ صلاحیتیں خالی ملیں گی۔ لیکن ان کا اصل استدلال یہ ہے کہ یہ مسئلہ اسلامی قدروں اور اصولوں سے متغایر ہے۔ انھوں نے اپنے موقف کے حق میں قرآن کریم سے دو نصوص پیش کیے ہیں۔ ایک سورۂ مائدہ کی آیات: ۲۷۔۳۲، جن میں آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، کہ ایک کی جارحیت کا دوسرے نے جواب نہیں دیا، بلکہ اعلان کر دیا کہ اگر تو مجھے قتل کر دے گا تو بھی میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ دوسری سورۂ حم السجدہ کی درج ذیل آیت ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا
الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ○ (آیت: ۳۴)

"اور (اے نبی) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا۔"

آگے انھوں نے اس موقف پر وارد ہونے والے ممکنہ اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ یہ بات درست نہیں کہ یہ آیات انفرادی جارحیت سے متعلق ہیں۔ سیاقِ کلام کا تقاضا ہے کہ ان سے مسلمانوں کو ان کے اجتماعی سلوک میں اصول پسندی سکھانا مقصود ہو۔

۲۔ یہ خیال غیر حقیقت پسندانہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے یہ موقف اختیار کیا تو وہ دشمنوں کے لیے لقمۂ تر بن جائیں گے۔ کوئی بھی ایٹمی طاقت انھیں ڈرا دھمکا کر ان سے اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کروا لے گی، یا بہ صورتِ دیگر صفحۂ ہستی سے نابود کر دے گی۔

کیوں کہ آج کی دنیا میں کوئی ایک ملک اتنا طاقت ور نہیں کہ دوسرے ملکوں کو ساتھ لیے بغیر اپنی مرضی چلا سکے۔

۳۔ یہ خطرہ مبالغہ آمیز ہے کہ مسلمانوں کے یہ موقف اختیار کرنے کے نتیجے میں اندیشہ ہے کہ ان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور دینِ اسلام کا کوئی نام لیوا نہ رہ جائے، کیوں کہ آج مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد ان ملکوں میں بھی بستی ہے جو ایٹمی طاقت اور دوسرے تباہ کن اسلحے سے لیس ہیں۔

۴۔ اس مسئلہ پر مصالح اور مفاسد، فوائد اور نقصانات کا موازنہ کیا جائے تو فسادِ عام برپا کرنے والے اسلحہ کے بنانے، رکھنے اور ممکنہ استعمال کے نقصانات کا پلہ بہت بھاری ہے، اتنا بھاری کہ اس سے متوقع فوائد اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔(۱)

تجزیہ و محاکمہ

اس مسئلے پر دونوں فریقوں کے موقف اور ان کے دلائل پر ایک نظر ڈالنے سے بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور نازک ہے، اس لیے اس کے سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قبل اس کے تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ غور و فکر کے لیے چند نکات پیش خدمت ہیں:

۱۔ اسلام نے انسانی جان کی حفاظت پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اس کا شمار مقاصدِ شریعت میں کیا گیا ہے۔ کسی بے قصور کی جان لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ جب کہ عام تباہی کے اسلحے بڑی تعداد میں بے قصوروں کی جانیں ضائع ہونے کا موجب بنتے ہیں۔

۲۔ اسلام نے جنگ کے دوران مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان فرق کیا ہے۔ ان اسلحہ کے استعمال کی صورت میں یہ فرق کسی بھی صورت میں ملحوظ نہیں رکھا جاسکتا۔

---

(۱) مقاصدِ شریعت، ص ۲۹۸۔۳۰۱ (تلخیص)

۳۔ دنیا کا دستور ہے کہ طاقت ور دوسروں کی جارحیت سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو طاقت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر موجودہ صورت حال میں طاقت کا حصول کیوں کر ممکن ہے؟

۴۔ اسلام مسلمانوں کو اس مقام پر دیکھنا چاہتا ہے کہ ان کے دشمن ان سے خوف زدہ رہیں اور ان کے بارے میں کوئی جارحیت کرنے سے قبل ہزار بار سوچیں۔ مسلمان اس مقام تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟

۵۔ ایک طرف قرآن وسنت کے وہ نصوص ہیں جن میں برائی کا جواب بھلائی سے دینے اور جارحیت کے جواب میں خود سپردگی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے، دوسری طرف ایسے نصوص بھی ہیں جن میں جارحیت کا اسی انداز سے جواب دینے اور مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دونوں میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

۶۔ دنیا کے ہر قانون میں اصولی احکام کے ساتھ استثنائی صورتیں بھی ہوتی ہیں۔ زیر بحث مسئلہ میں اسلام کے اصولی موقف کے ساتھ محاصرۂ طائف کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے منجنیق استعمال کرنے کی استثنائی مثال بھی موجود ہے۔

۷۔ اگر مقاصد شریعت میں شامل چیزوں کے درمیان تعارض ہو رہا ہو تو ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کیا بنیاد ہوگی؟ زیر بحث مسئلے میں مسلمان طاقت ور رہیں اور اسلام غالب ہو، یہ بھی شریعت کا مقصد ہے اور دنیا کو عام تباہی مچانے والے ہتھیاروں سے محفوظ رکھنا بھی شریعت کا مقصد ہے۔ دونوں میں تعارض کی صورت میں کس کو ترجیح دی جائے؟

موتمر العالم الاسلامی کی قرارداد

مارچ ۱۹۸۳ء میں موتمر العالم الاسلامی کے زیر اہتمام کراچی یونی ورسٹی پاکستان میں ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا گیا تھا، جس کا موضوع تھا: Nuclear Arms Race and Nuclear Disarmament: The Muslim Perspective۔ اس موقع پر

شرکائے سیمینار کی جانب سے جو قراردادیں منظور کی گئی تھیں، انہی پر اس گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے۔

۱۔ اسلام کی تعلیمات، جو قرآن وسنت میں بیان کی گئی ہیں، مسلمانوں کو حکم دیتی ہیں کہ وہ غیر مشروط طریقے پر ہلاکت کے وحشیانہ اسلحہ کے کسی بھی طرح کے استعمال کی مخالفت کریں، اس لیے کہ اسلام میں بلا کسی تفریق کے انسانوں کی جانوں اور املاک کی بربادی کی گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ جو ممالک نیوکلیائی اسلحہ رکھتے ہیں ان کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ان سے دست بردار ہو جائیں۔

۳۔ نیوکلیائی اسلحہ کی تیاری کی تمام صورتیں موقوف کر دی جائیں۔ جو اسلحہ تیار شدہ ہوں انہیں بہ تدریج ضائع کر دیا جائے اور موجودہ نیوکلیائی مادوں کو پرامن کاموں میں استعمال کیا جائے۔

۴۔ یہ بیداری لانے کی بھرپور کوشش کی جائے کہ جو وسائل نیوکلیائی اسلحہ کی تیاری میں صرف ہوتے ہیں انہیں بھکمری، بیماری، جہالت اور غربت، جن سے عالم انسانیت کا بڑا حصہ، خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک دوچار ہیں، ان کو دور کرنے میں صرف کیا جائے۔

۵۔ افریقہ، مشرق وسطی اور جنوبی ایشیا میں نیوکلیئر فری زون قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔(۱)

☆☆☆

---

(1) Ethics and Weapon of Mass Destruction, P. 344

کتابیات

(ا) کتب

عربی

۱- آلوسی، سید محمود روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۴۱۵ھ

۲- ابن الاثیر، عز الدین ابو الحسن علی بن محمد الجزری أسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۶ء

۳- ابن الاثیر، مجد الدین ابو السعادات الجزری النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، المطبعۃ العثمانیۃ مصر، ۱۳۱۱ھ

۴- ابن الجوزی عبد الرحمن بن علی زاد المسیر فی علم التفسیر، المکتب الاسلامی بیروت

۵- ابن حجر، احمد بن علی العسقلانی فتح الباری بشرح صحیح البخاری دار المعرفۃ بیروت

۶- ابن عابدین محمد امین رد المحتار علی الدر المختار، مطبع در سعادت مصر

۷- ابن العربی ابو بکر، الاشبیلی المالکی احکام القرآن مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۳۱ھ

۸- ابن قدامۃ، ابو محمد عبد اللہ المقدسی المغنی علی مختصر الخرقی مکتبۃ الریاض الحدیثۃ الریاض، ۱۹۸۱ء

۹- ابن کثیر، عماد الدین اسماعیل الدمشقی البدایۃ والنہایۃ، دار الریان للتراث القاہرۃ ۱۹۸۸ء

۱۰- ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دار الحدیث القاہرۃ ۱۴۱۳ھ

۱۱- ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، دار المعرفۃ بیروت، ۱۹۷۱ء

۱۲- ابن ماجۃ، محمد بن یزید القزوینی السنن

۱۳- ابن منظور، ابو الفضل جمال الدین الافریقی لسان العرب دار صادر بیروت

۱۴- ابن ہشام، عبد الملک سیرۃ النبی المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر، ۱۳۴۶ء

۱۵- ابو حیان الاندلسی البحر المحیط، دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۳ء

۱۶- ابو داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی السنن

۱۷- احمد بن حنبل الشیبانی المسند

۱۸- بخاری ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل الجامع الصحیح

۱۹- بخاری الأدب المفرد المطبعۃ السلفیۃ القاہرۃ ۱۳۷۹ھ

۲۰- بغوی الحسین بن مسعود الفراء، المکتب الاسلامی بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

۲۱- بقاعی ابراہیم بن عمر نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، دائرۃ المعارف العثمانیۃ حیدر آباد ۱۹۷۹ء

۲۲- بیضاوی عبد اللہ بن عمر، القاضی الشافعی انوار التنزیل و اسرار التاویل (تفسیر بیضاوی) دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۴۰۸ھ

۲۳- ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ السنن

۲۴- جوہری اسماعیل بن حماد تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ طبع مصر ۱۲۸۲ھ

۲۵۔ الحاکم، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ النیسا بوری، المستدرک علی الصحیحین، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
۲۶۔ حلبی، علی بن برہان الدین، انسان العیون فی سیرۃ الأمین المأمون المعروف بالسیرۃ الحلبیۃ، المکتبۃ الإسلامیۃ، بیروت۔
۲۷۔ دارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمن، السنن
۲۸۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، تحقیق و مراجعۃ: السید سابق، دار الجیل، بیروت، ۱۴۲۶ھ
۲۹۔ رازی، فخر الدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۰ء
۳۰۔ الراغب الاصفہانی، ابو القاسم حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، تحقیق و ضبط: محمد سید کیلانی، دار المعرفۃ، بیروت
۳۱۔ رشید رضا، تفسیر القرآن الکریم (تفسیر المنار) دار المنار، القاہرۃ ۱۹۴۷ء
۳۲۔ زحیلی، وہبۃ، آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، دار الفکر، دمشق ۱۹۸۱ء
۳۳۔ زمخشری، ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، طبع مصر ۱۹۷۲ء، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۵ء
۳۴۔ شلتوت، محمود، الفتاوی، دار الشروق، القاہرۃ ۲۰۰۱ء
۳۵۔ شوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴ء
۳۶۔ شوکانی، نیل الأوطار
۳۷۔ طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تأویل آی القرآن (تفسیر الطبری) تحقیق: محمود محمد شاکر، احمد محمد شاکر، دار المعارف، مصر
۳۸۔ عبد الرزاق، المصنف، تحقیق و تخریج: حبیب الرحمن الاعظمی، المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۷۲ء
۳۹۔ عظیم آبادی، شمس الدین، عون المعبود شرح سنن ابی داؤد، المکتبۃ السلفیۃ، المدینۃ المنورۃ ۱۹۶۹ء
۴۰۔ عینی، بدر الدین محمود بن احمد، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۷۲ء
۴۱۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۸۸ء، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب ۱۹۸۷ء
۴۲۔ مسلم بن حجاج القشیری، الصحیح
۴۳۔ مناوی، محمد المدعو بعبد الرؤف، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر
۴۴۔ منذری، عبد العظیم، الترغیب والترہیب
۴۵۔ نسائی، ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب، السنن
۴۶۔ نووی، یحیی بن شرف، شرح صحیح مسلم، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۵ء، دار الریان للتراث، القاہرۃ ۱۹۸۷ء
۴۷۔ الفتاوی العالمگیریۃ (الفتاوی الہندیۃ) المطبعۃ الکبری الأمیریۃ، بولاق، مصر، ۱۳۱۰ھ
۴۸۔ الموسوعۃ الفقہیۃ، وزارۃ الأوقاف والشئون الإسلامیۃ، دولۃ الکویت ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء

اردو

۴۹۔ ابراہیم، ابو الفضل محسن، جدید حیاتیاتی مسائل اور اسلام، ترجمہ: اسرار احمد خان، مرکز الدراسات العلمیۃ، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء

۵۰۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۹ء
۵۱۔ بوکائی، موریس، بائبل قرآن اور سائنس، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۳ء
۵۲۔ رحمانی، خالد سیف اللہ، حلال و حرام، دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد، ۱۹۹۳ء
۵۳۔ سنبھلی، برہان الدین، موجودہ زمانے کے مسائل کا شرعی حل، طبع دہلی، ۱۹۹۲ء
۵۴۔ سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، دارالاشاعت کراچی، ۲۰۰۲ء
۵۵۔ صدیقی، محمد نجات اللہ، مقاصد شریعت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز دہلی، ۲۰۰۹ء
۵۶۔ عمری، سید جلال الدین، غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز دہلی۔
۵۷۔ قرضاوی، یوسف، اسلام میں حلال و حرام، ترجمہ شمس پیرزادہ، مکتبہ الاسلامیہ ممبئی، ۱۹۷۷ء
۵۸۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز دہلی
۵۹۔ ندوی، محمد شمس الاسلام، تخلیق انسانی کے مراحل اور قرآن کا سائنسی اعجاز، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی، ۱۹۹۳ء
۶۰۔ جدید فقہی مسائل اور ان کا مجوزہ حل (بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے فقہی اجلاسوں کی قراردادیں اور سفارشات) ادارہ اسلامک فقہ اکیڈمی کراچی، ۲۰۰۶ء
۶۱۔ رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے، ایفا پبلیکیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

(ب) مقالات

عربی

۶۲۔ الحسن، شادية الصادق، حكم الإسلام في التلقيح الصناعي، مجلة العلوم والبحوث الإسلامية السودان، العدد/۲، فروری ۲۰۱۱م
۶۳۔ الحول، هند، تأجير الأرحام في الفقه الإسلامي، مجلة جامعة دمشق للعلوم الاقتصادية والقانونية، مجلد ۲۷، شمارہ ۲۰۱۱م
۶۴۔ الطيار، عبد الله بن محمد، الضوابط الشرعية في المعاوضة على الحقوق و الالتزامات www.ao-islam.net

اردو

۶۵۔ انیس، منور احمد، تولیدی حیاتیات، ترجمہ اسرار احمد خاں، سہ ماہی مجلہ آیات علی گڑھ، جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری۔ اپریل ۱۹۹۰ء
۶۶۔ خورشید احمد، انسانی صلاحیت اور قرضوں کا بوجھ، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، دسمبر ۱۹۹۸ء
۶۷۔ مقاوت، ماہرہ ایم، کام مقام ملازمت اور اسلام، ترجمہ جمیل احمد، سہ ماہی مجلہ آیات علی گڑھ، جلد ۵، شمارہ ۱، جنوری۔ اپریل ۱۹۹۳ء
۶۸۔ محمد شمس الاسلام ندوی، سرجری کی اہمیت، مضمون مشمولہ سہ ماہی مجلہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۹ء

☆ انگریزی کی بعض کتب و مقالات اور websites جن سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے مکمل حوالے متعلقہ مقامات پر دیے گئے ہیں۔

☆☆☆

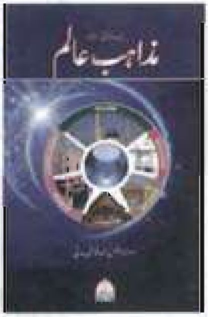

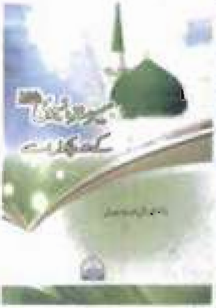

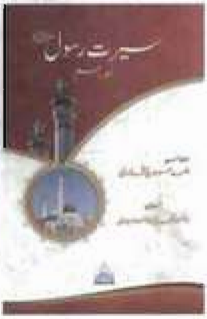

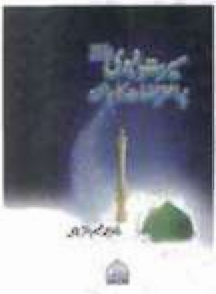

رحمان مارکیٹ ● غزنی سٹریٹ ● اردو بازار ● لاہور ● پاکستان
Ph: 042-37231119 , 0321-4021415
qasimulaloom@gmail.com